میری زندگی کا مقصد

ڈاکٹر محمد شاھین سعد تنولی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب:	میری زندگی کا مقصد
نام مصنف:	ڈاکٹر محمد شاہین سعد تنولی
مطبع:	ضیاء پرنٹرز
کمپوزنگ / پیج لے آؤٹ:	ارینہ گرافکس ڈیزائنر
سن اشاعت:	۲۰۲۲
سرورق:	افنان ارشد
اسسٹنٹ:	حذیفہ نعیم
ISBN:	978-969-23794-0-3
قیمت:	-/600 روپے
ملنے کا پتہ:	book.mzkm@gmail.com
ویب سائٹ:	www.dr-shaheen.com

بسم الله الرحمن الرحيم

انتساب

میرے والد محترم

محمد اورنگزیب (مرحوم)

کے نام

جن کی انتھک محنت، بے لوث لگن اور اخلاص کا ثمر مجھے آج تک مل رہا ہے

اور

جن کی سادگی اور سچائی میرے لیے مشعلِ راہ ہے

تقدیم

انسان کو دو اموات کے مابین مقید، ایک حیاتِ متناہی عطا کر کے اس کرہء ارضی پر مبعوث فرمایا گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کیوں؟ یہ ''کیوں'' پردہِ خیال پر ناچنے والی اِک ایسی پری ہے جو بے لباس و بے لگام ہو تو راغب الی المعصیت اور پردہ پوش ہو تو تشنہ خیالی کا سبب بن جاتی ہے۔ اِس کے لباس کا موزوں ہونا اُسی قدر ضروری ہے جتنا اُس کے بدن پر لباس کا ہونا۔ معصیت جب اپنی حدوں کو پھلانگ لے تو بغاوت بن کر ظاہر و باطن میں تلاطم برپا کر دیتی ہے۔ دُنیا میں متعدد طبقاتِ فکر اپنی وُسعتِ خیال و بساط کے تناسب سے اس محبوب و معشوق زندگی کو تصور میں ڈھال کر قرطاس پر منتقل کرتے رہے۔ وہ افراد جن کے شب و روز مادہ کی جستجو میں صَرف ہوتے ہیں، وہ مادی حقائق اور اُس کے متعلقات کے سمجھنے کو غایتِ زندگی قرار دے چکے۔ ابتدائی جماعتوں کی سائنس میں پڑھا تھا کہ مادہ تین ہی حالتوں میں موجود ہوتا ہے، ٹھوس، مائع اور گیس۔ اِن تین حالتوں میں موجود، موجودات، مذکورہ طبقہ فکر کے ہاں اصل الاصول ہوں گے اور دیگر تمام مسئلہ ہائے زندگی اگر اپنی وقعت قائم رکھنا چاہتے ہیں تو اِن سے اپنے

تعلق کی وضاحت کے پابند ہوں گے۔ اہلِ علم طبقات اجسام اور اُن کے متعلقات کی علمی وضاحت اور اس پر دروبینی کو مقصدِ حیات مانتے ہیں۔

اُستاد نے اس دور میں کیا علم پڑھایا
مادہ کے تخیل کا خریدار بنایا
نے رُوح جو پابندِ نباتات و جمادات
مت بحث میں لا اس کو کہ نہ ٹھوس نہ مائع

شعبۂ فنون سے متعلق افراد نے زندگی کو سٹیج اور اُس پر ادا کیے جانے والے مختلف کرداروں کی سرگزشت جانا جس کا حقیقت سے دُور دُور کا تعلق نہیں بلکہ محض ''اک خواب اور خوابِ پریشاں ہے''۔ الغرض ہر ایک نے زندگی کو اپنی آنکھ سے دیکھا اور کسی متعین سمت میں دیکھا، تانگے میں جُتے اس گھوڑے کی طرح جس کی آنکھوں پر موجود گاگل اُس کی نگاہوں کو سڑک کی دائیں اور بائیں جانب کی موجودات سے بے بہرہ رکھتی ہے۔ چار اندھوں کی مشہور کہانی تو آپ نے سُنی ہوگی جو ہاتھی دیکھنے جاتے ہیں۔ ایک اندھے کے ہاتھ میں ہاتھی کی دُم، دُوسرے کے ہاتھ میں اُس کی سُونڈ، تیسرے کو اُس کا جسم اور چوتھے کو اُس کے کان پکڑائی دیتے ہیں۔ پہلے اندھے کے خیال میں ہاتھی رسی جیسا، دوسرے کے خیال میں درخت کے تنے جیسا، تیسرے کے خیال میں چٹان جیسا اور چوتھے کے خیال میں پنکھے جیسا ہوتا ہے۔ خاکم بدہن آج ہم بھی اس زندگی کے بارے میں ایسی ہی وُسعتِ نظر

وخیال رکھتے ہیں۔ رہی بی زندگی، تو وہ خیالات وافکار کے اس پُرتنوع اور رنگین کینوس پر اپنا اصل رنگ تلاش کرنے کی متمنی ہے۔

زندگی ہے تلاش میں شاید
دیکھتا ہوں بھٹک رہی در در
یہ نہیں تھی کبھی مری غایت
آ نکل جسم سے، اے دیدہ ور
چھین لے کچھ جہان سے فرصت
روح کے سنگ ہو کچھ وقت بسر

ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ کی کتاب 'اسلام کی نشاۃ ثانیہ۔ کرنے کا اصل کام' کے آغاز ہی میں ایک جُملہ پڑھا تھا جو آج بھی ذہن کے کسی گوشے پر چسپاں ہے۔

انسان کے ذہنی اور فکری سفر کے دوران ایک نقطہ نظر جو مسلسل پختہ ہوتا چلا گیا اور جسے بجا طور پر اس پورے فکر کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ، اِس میں خیال اور ماورائی تصورات کی بجائے ٹھوس حقائق اور واقعات کو غور وفکر اور سوچ و بچار کا اصل مرکز ومحور ہونے کی حیثیت حاصل ہے اور خدا کے بجائے کائنات، روح کے بجائے مادہ، اور موت کے بعد کسی زندگی کے تصور کی بجائے حیاتِ دنیوی کو اصل موضوع بحث قرار دیا گیا ہے (اسلام کی نشأۃ ثانیہ۔ کرنے کا اصل کام۔ص نمبر ۵)۔ المختصر انسان کے

فکری ارتقا کے نتیجے میں وجود میں آنے والے اِس تصور، جس میں خالقِ کائنات کو عملی طور پر مادہ سے، رُوح کو جسد سے اور آخرت کو دُنیا سے replace کرنے کی جو جسارت کی گئی، وہ راقم الحروف کی رائے میں انسان کیلئے نہ صرف نظریاتی سطح پر ایک مُہلک تبدیلی ہے بلکہ عملاً کہیں، خاکم بدہن، دنیا کو ایک ایسے منہج پر نہ لا کھڑا کرے کہ، قبل از انجام، خلقِ خدا، قیامت برپا کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

ابداع عالم سے آج کے گلوبل ورلڈ آرڈر تک نظریات کا یہ تصادم نوشتہ دیوار رہا ہے لیکن اِس دور میں یہ پوری شدت کے ساتھ تمام شعبہ ہائے زندگی میں مختلف اشکال میں جلوہ افروز ہوا۔ احوالِ ظاہری میں، مادی نظریات کے حاملین اپنے نظریات کا رنگ زندگی کے تمام گوشوں پر چڑھا چکے اور مقصدِ زندگی طے کرنے میں کارفرما عوامل اسی فلسفہ سے اصطلاحات مستعار لیتے نظر آتے ہیں لیکن آج بھی کہیں کسی نیم مرعی گوشے سے کبھی کبھار کوئی نحیف سی آواز ضرور سُنائی دیتی ہے جو وقت کے شور میں یا تو گُم ہو جاتی ہے یا اس قدر اجنبی معلوم ہوتی ہے کہ اُسے نظریاتی سطح پر قلیل اقلیت قبول کر بھی لے، عملاً اُسے ناقابلِ ترویج ہی سمجھا جاتا ہے۔ نظریات کے تقابلی مطالعے سے شغف رکھنے والے راقم سے اتفاق کریں گے کہ حق جتنی بھی نحیف آواز میں ہو، اُس کی حقانیت پر کوئی آنچ نہیں آتی۔

ایسے میں کتابِ ہذا ''میری زندگی کا مقصد'' بھی انسانی زندگی کا مقصد اُس کے موجود مدارج میں تلاش کرنے کی ایک ادنیٰ سی سعی ہے۔ زندگی کے مقصد کے تعین کیلئے اس امر کو ضروری سمجھا گیا کہ موجودہ تصورات

ونظریات کا جس قدر ممکن ہو ایک جائزہ لیا جائے اور محاورہ ء وقت idiom (of the time) میں اُس کو پیش کیا جائے:

اک چراغِ لالہ لے کر ڈھونڈتا تھا نامہ بر
تھا پیامِ عرش میرے نام، مجھ سے بات کر
وہ زماں کا سعد جس کا نام اکثر ہر سنا
ہے شکایت کا ترنم اس کے بپھرے ہونٹ پر

ملا اک شب میں فرعونِ مصر کو
ملا بیٹے کو پہلے پھر پدر کو
نہ تھا نادم کوئی اپنے کیے پے
چھپاتا باپ تھا اپنے پسر کو

زندگی کے مقصد کے تعین کیلئے نظم ''مقصدِ حیات'' کو مرکزی نظم کی حیثیت حاصل ہے اور یہ نظم راقم الحروف کے فکری ارتقا کو پیش کرنے کی ایک سعی ہے۔ ''شکایت'' اور ''میدانِ محشر سے'' اس نظریہ کو تقویت دینے والے عوامل کی داستان ہے:

ہر رات اپنے رب سے ہُوں خلوتوں میں گویا
میں طالبِ ہدایت میرا شعور سویا
سجدے میں سر گِرا لُوں یہ تو مجھے خبر ہے
پر فکر میں جہالت کا بیج ہم نے بویا

معنوی اعتبار سے کتاب میں موجود نظمیں کہیں سوال و جواب کی شکل اور کہیں داستان کی شکل میں افکار کا تقابل اور کہیں محبت کو مختلف اسالیب سے عنوان کیے ہوئے ہے۔

کلام میں موجود تمام خوبیاں اللہ کی عنایت ہیں جن پر راقم اللہ کے حضور سجدۂ شکر بجا لاتا ہے اور تمام نقائص خاکسار کے نفس کی شرارت ہیں جن پر قارئین سے معذرت خواہ ہوں:

یہ کہانی پڑھ کے سو جائیں گے سب اہلِ وطن
سب کہانی بن نہ جائیں اس ستمگر دار پر

ڈاکٹر محمد شاہین سعد تنولی

خیلي تازہ خیلي خالص بي گناہ و مستقیم

صاحبِ دیوان کا حکم کہ۔۔۔اک تحریر۔۔۔اُن کے دیوان کے نام۔۔۔

اس احساس کے ساتھ بجالا رہا ہوں کہ آدابِ تحریر سے کم واقفیت کہیں میرے جذبات کی ترجمانی میں کوئی کمی نہ کر دے، لیکن پھر جذبات کی حدت نے قلم اُٹھانے کا حوصلہ دے ہی دیا۔ یُوں تو میں اپنے لیے اور اپنے اللہ کیلئے بہت کچھ لکھتا ہوں اور لکھنا چاہتا ہوں لیکن مدتوں بعد میں کسی اور کیلئے کُچھ لکھ رہا ہوں۔

میرا اندازِ بیاں ڈاکٹر شاہین کے مقابلے میں کمزور صحیح، لیکن اُردو زبان سے میرا رشتہ اور کلامِ شاہین سے جذباتی وابستگی اس تحریر میں میرے ہتھیار ہیں۔ شاید تحریر میں وہ معیار نہ رکھ سکوں جو اس مجموعہ اور صاحبِ مجموعہ کے لیے انصاف کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔

عُمر گزارنے کے بعد اگر میں کچھ سمجھ پایا ہوں تو وہ یہ کہ یہ دنیا اک سراب کی سی حیثیت رکھتی ہے اور اس مضمون پر ڈاکٹر صاحب کی فکر و بصیرت میرے لیے مشعلِ راہ ہے۔

جب بھی میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہوتا ہوں تو مجھے ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی میرے دل و دماغ کو یہ یقین دلا رہا ہو کہ اس غیر حقیقی کیفیت میں میرے ساتھ ایک رفیق ہے، ایک ہم مقصد انسان ہے اور ہم دونوں کی جُستجو مشترک ہے، البتہ معیارِ تقوٰی پر مجھے خود کو ان کا شاگرد گردانے میں کوئی عار نہیں۔ کسی انسان کو سچا سمجھنے پر شاید سب سے زیادہ قابلِ قبول دلیل یہ ہو کہ میں اُس کے اوصاف خود میں یا اپنی اولاد میں دیکھنا چاہوں، ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میں اسی نسبت کا حامل ہوں۔ اُن کا لکھا اور کہا نہ صرف بہترین ہے بلکہ غیر معمولی بھی۔ مذہبی صلاحیت کے ساتھ ساتھ اللہ نے انہیں غیر معمولی فلسفیانہ سوچ اور پاکیزہ جذبات سے نوازا ہے۔ مجھ جیسے عشق کی گلی کے مسافر کیلئے ان کا کلام مشعلِ راہ ہے۔

ان کا کلام اصل اور نقل کی تفریق پر ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ وہ میرے لیے ایک ایسا مرہم ہیں جو باطنی جنگ سے پیدا ہونے والے زخموں کا علاج ہے۔ اُن کی یہ کتاب میرے لیے اثاثہ ہے۔

ان کا کلام مادی دنیا اور ماورائی حقائق کے درمیان جو ربط پیدا کرتا ہے اس کو سمجھنے کیلئے اپنی خواہشات کو قربان کرنا پڑتا ہے اور آج کا انسان اگر کسی طرح اس قربانی پر آمادہ ہو بھی جائے تو اُس کی نیم دلی باطن میں احساس زیاں پیدا کرتی ہے، یہ کلام غالباً انہی لوگوں کو راہ پر لانے میں ممد و معاون ہو۔

صرف عنوانات پر ایک نگاہ ڈالیں تو وہ قلب کو اتھل پتھل کرنے کو کافی ہیں۔ میری بے چین روح کو یہ کتاب پکارتی ہے اور اُسے داخلی اور

خارجی خطرات سے تحفظ کا احساس دلاتی ہے۔

خیلی تازه، خیلی خالص، بی گناه و مستقیم

ڈاکٹر علی احسن

ٹورنز یونیورسٹی آسٹریلیا

فہرست

میرے مولا کہاں کہاں ہے تو..... 18
مجھے آقا بلائیں گے..... 21
چند اشعار ایک طالبہ علم کی یاد میں..... 24
ایک بچہ..... 26
شکایت..... 28
پردیس..... 34
بیٹی..... 39
مقصدِ حیات..... 43
غزل..... 48
کانووکیشن..... 51
سروس..... 54
وقت..... 59
شہداء بچوں کے نام..... 63

میدانِ محشر سے..... 66
رباعی..... 82
داستانِ حسرت..... 83
فرعون سے اِک ملاقات..... 86
رباعی..... 91
مولوی صاحب..... 92
غزل..... 95
کرونا وائرس..... 97
ڈاکٹر اختر نواز ملک کے نام..... 103
غزل..... 106
وطن جو بنایا تھا اس کی کہانی..... 110
گناہ..... 116
نئی حویلی..... 119
رباعی..... 123
مادہ پرستی..... 124
ڈاکٹر اسرار احمد کے نام..... 127
غزل..... 130
پہلی ملاقات..... 132
رباعی..... 134
ساحل سمندر پر..... 135

صنف خاص (اختر نواز)..... 141
صنف خاص (علی احسن)..... 142
تم مجھے اچھے لگتے ہو..... 143
غزل..... 146

میرے مولا کہاں کہاں ہے تُو

میرے مولا کہاں کہاں ہے تُو

عرش میں، فرش میں، مکاں میں تُو
بحر میں، بر میں، ہر جہاں میں تُو
میرے اِدراک کی حدوں سے بھی
ہے پرے، کون و لا مکاں میں تُو

رنگ و رونق، جہاں جہاں ہے تو
میرے مولا کہاں کہاں ہے تُو

تیری رحمت کو جوش ہے پَل پَل
جوش کو پھر دوام ہے حاصل

شان تیری کہ تُو نوازے ہے
دم ہے جب تک، ہے تُو کرم مائل

تیرا طالب جہاں، وہاں ہے تُو
میرے مولا کہاں کہاں ہے تُو

تُو ہے واحد، کوئی مثال نہیں
اور تری ذات کو زوال نہیں
تُو ہے ظاہر کہ تُو ہی باطن ہے
تُجھ بِنا کوئی بھی کمال نہیں

علمِ موجود میں عیاں ہے تُو
میرے مولا کہاں کہاں ہے تُو

تُو مَلک یومِ احتسابِ بشر
سروری تیری ذات کا ہی ہُنر
کیا کہیں وصل یا کہ یومِ جزا
بادشاہی فقط تری ہی قدر

حکم تیرا وہاں، جہاں ہے تُو
میرے مولا کہاں کہاں ہے تُو

عبد تیرا، ہے میرا مالک تُو
ہُوں میں محتاج، میرا رازق تُو
مجھ کو مالک، بنا دے بندہ جو
لے مدد تُجھ سے صرف، لائق تُو

ہے تُو ظاہر مگر نہاں ہے تُو
میرے مولا کہاں کہاں ہے تُو

سعد کو راہ وہ دِکھا مولا
فوز پاؤں، ملے رضا مولا
ہر سحر لَوٹتا ضلالت کو
تیرے قدموں میں ہوں، بچا مولا

ہے وہ پُر نم کہ بس فغاں ہے تُو
میرے مولا کہاں کہاں ہے تُو

مجھے آقا بُلائیں گے

بپا جب حشر ہو گا، مصطفٰیؐ کے پاس جائیں گے
میں کیسے سامنے آؤں گا مجھ کو جب بلائیں گے

جو ہو گا نور ان کے چہرۂ انور پے لاثانی
گریں گے لفظ بن کے پھول ہونٹوں سے گلستانی
برستا ہو گا ان کی ذات سے فیضانِ قرآنی
مرا قرآن سے تھا جو تعلق، جب دکھائیں گے
میں کیسے سامنے آؤں گا مجھ کو جب بلائیں گے

مراغم تھا انہیں، دنیا میں رب سے خیر کے طالب
رہی معراج میں بھی فکرِ امت فکر پے غالب
رہا کیا متّبع سنت؟ فرشتے پوچھے جائیں گے
میں کیسے سامنے آؤں گا مجھ کو جب بلائیں گے

مجھے جب یاد آئے گی، 'فَتَرضٰی' کی نزولی شاں
صحابی کو جو کہتے تھے، نہ رُوٹھے، گرچہ مشرک، ماں
میں اُن کا امتی ہوں میرا نامہ جب سجائیں گے
میں کیسے سامنے آؤں گا مجھ کو جب بلائیں گے

جہاں ان کی غلامی میں عمرؓ بھی اور علیؓ بھی ہیں
غنیؓ، صدیق اکبرؓ بھی، زمانے کے ولی بھی ہیں
وہاں بے فیض سے افکار میرے کیوں سمائیں گے
میں کیسے سامنے آؤں گا مجھ کو جب بلائیں گے

مرے ذمے لگایا تھا کہ غائب کو بھی پہنچاؤں
سمجھ آیا ہے جو قرآں وہ اوروں کو بھی سمجھاؤں
کہاں تک کی رسائی، کیسے آقا کو بتائیں گے
میں کیسے سامنے آؤں گا مجھ کو جب بلائیں گے

نہیں منظور آثم کو، نبیؐ ناراض ہوں اک پل
کروں گا اب اطاعت بھی بنے گا عشق تب منزل
خطا سرزد ہوئی پھر بھی، نبیؐ سینے لگائیں گے
میں گر جاؤں گا قدموں میں مجھے جب وہ بلائیں گے

بپا جب حشر ہو گا، مصطفیٰؐ کے پاس جائیں گے
میں کیسے سامنے آؤں گا مجھ کو جب بلائیں گے

چند اشعار ایک طالبہ علم کی یاد میں

حسرتیں میں بو رہا ہوں وقت کی دیوار پر
تم فسانہ کہہ کہ بانٹو شہر کے چوبار پر

رَول دی مٹی میں عزت دُخترِ شاہین کی
عصبیت تھی یا تھی شہوت راکھ کے مینار پر

تو مکرم ہے مجھے کہ تو مرا اُستاد ہے
علم کی تحقیر ہو گی اس قبیح اظہار پر

وقت کے انوار میں وہ یوں تلاشے زندگی
جیسے گریہ غم ہو ٹوٹا عشق کے بیمار پر

کھو گئی تیری مہک گالوں کی لالی چھن گئی
درد کی تسکیں نہ ہو گی درد کے اظہار پر

تو نوائے کرب کی تصویر بن کے رہ گئی
ضبط کے بندھن ہیں ٹوٹے شرم کی چھتنار پر

یہ کہانی پڑھ کے سو جائیں گے سب اہلِ وطن
سب کہانی بن نہ جائیں اِس ستمگر دار پر

ایک بچہ

گلی کے نکڑ پے ایک بچہ
لگن کا سچا
کچیلے کپڑے تھے اس کے تن پہ
مگر تھی من میں
اک اجلی چادر تنی ہوئی سی
کھلونے والے سے کہہ رہا تھا
کہ یہ کھلونے
جو نرم مٹی کے گرم پیڑوں سے بن کہ آئیں
کچھ ایسے آئیں کہ میرے من سے یہ پھر نہ جائیں
بہت سے پیسوں کے ملتے ہوں گے
تمہارے بچے مزے میں ہیں کہ
وہ ڈھیر سارے کھلونے ان کے
ہیں اتنے پیارے کھلونے ان کے
کھلونے والے کی آنکھ نم تھی

کہ وہ کھلونا گر اس کو دیتا
تو اس کا بچہ جو کتنی راتوں سے گرم پیڑے کو رو رہا تھا
جو کب سے دل میں بس اک تمنا سمو رہا تھا
فقط جنوں کی کہانیوں پہ نجانے کتنی ہی راتیں بیتیں
نجانے کتنی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
تھکے تھکے سے قدم اٹھاتا کھلونے والا
ہر اک گلی میں صدا لگاتا
کھلونے لے لو، کھلونے لے لو
وہ کس ڈھٹائی سے اپنے بچے کے سارے ارماں
حسین لوگوں میں بانٹتا تھا
اور اپنے بچے کی ساری خوشیاں
کسی کی آنکھوں میں کھوجتا تھا
اور اس کا بچہ
تمام فکروں سے بے خبر ہے
بہت ہی دلکش ہنسی سجائے یوں سو رہا ہے
کہ جیسے دنیا کے سب کھلونے اسی کے آغوش میں پڑے ہیں

شکایت...

اک چراغِ لالہ لے کر ڈھونڈتا تھا نامہ بر
تھا پیامِ عرش میرے نام، مجھ سے بات کر
وہ زماں کا سعد جس کا نام اکثر ہے سنا
ہے شکایت کا ترنم اس کے بپھرے ہونٹ پر

اے خُدا تجھ کو کہاں ڈھونڈیں کہ ہے تو عرش پر
عاشقانِ بے سبُو سب گھومتے ہیں فرش پر

طُور پر، دیر و حرم، دشت و سمندر میں ملے
دل کی دنیا کو بسائے پھر اسی گھر میں ملے
فرش تو پھیلا ہوا ہے ہر بجانب شرق و غرب
ہم تو مل جائیں ہیں اس دل میں بھی جو دل بے طلب

جو مٹائے فاصلے میں در کروں سب اس پے وا
کب تھے دیکھے خواب ہم سے تو نے ملنے کے بتا

ہے شکایت تجھ کو یہ بھی، دکھ تجھے بے حد دیے
جا تو لکھ لے اپنی قسمت تجھ سے یہ موتی لیے
پھر نہیں کہنا خوشی دل کو ذرا بھاتی نہیں
آرزو، امید کوئی تشنگی لاتی نہیں

فہم سے بھی دور میرے، ذات تیری با کمال
پوچھ لوں میں، مضطرب مجھ کو کرے ہے یہ سوال
کوئی قادر کہہ رہا، کوئی معمہ کہہ رہا
کیا تری توفیق سے جذبات میں یوں بہہ رہا؟

طُور شاہد ہے کہ تُو نہ تاب لا پایا تھا تب
لن ترانی سن کے بھی تو خواب لے آیا تھا جب

تھا خلیل اللہ کو فہمِ ذات، جب تھے آگ میں
تان دیپک ہو نہ پائے گی تری اس راگ میں

تو کہاں کب دید میری سے ہوا ہے آشنا
سب یہ منطق گھڑ رہا ہے جھوٹ پر اے بے وفا
کھا قسم کیا روح تیری ہے نہیں مجھ پر گواہ
کیا مرے نغمات میں تجھ کو سنائی دے نوا؟

کیوں ہے بانٹا تو نے لوگوں کو بہت طبقات میں
ایک رہتا ہے محل میں، اک نرے خدشات میں

ہے بجا تیری شکایت تُو بھی تو نادان سن
آ سحر کو اوڑھ لے آذان حبشی کی تو سن
کیوں شکن ماتھے پے تیرے ذکر جو شداد کا
کس خوشی سے کِھل رہا تُو، آج دن میلاد کا

یہ گلہ تجھ کو کہ عمرِ مختصر کیوں کی عطا
پھر تنوع اس قدر ہوتی طبیعت کیوں فدا

کچھ تو تُو بھی اس وفا کے عہد کا ہی مان رکھ
ہم سے کچھ تو دل لگا، کوئی مزہ اس کا بھی چکھ

تو کرے دعوے بہت، جا عشق کو تو عام کر
میں ترے دعوے کو مانوں، جان گر تو نام کر
اور یہ بھی جان لے میری امانت ہے یہ جاں
جب اسے لوٹا رہا کیوں کر رہا آہ و فُغاں
موت بھی تجھ کو عطا کی یوں کہ دائم تو رہے
اک نئی دنیا میں گھر ہو اور قائم تو رہے

کس قدر ہے سہل فطرت سے ہوا میں بدگماں
دِکھ رہی آدم کی منزل، آرزو اک بے کراں
ہم کو کیا معلوم تھا، ایسے فتن ہوں گے عیاں
ہوں گے ہم ابلیس کے پرکار میں پیدا وہاں

زور فتنوں کا اٹل مردِ مسلماں کا دیار
جانتے ہم کاش کیسی وہ امانت جس کا بار
قید کر رکھا ہمیں الحاد کی عشرت نے جب
چھید کر رکھا ہمیں اسلام کی فطرت نے تب

تھے صحابہ، ناز کرتا جن پے تھا جبریل بھی
کربلا کی داستاں سن رو رہا قابیل بھی

سعدؓ، طلحہؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علی المرتضٰیؓ
سب کا منصب، سب کا جھنڈا ہر گھڑی اونچا رہا
تھی ملائک کی جو حسرت وہ مقامِ عالیہ
تیرے حصے میں تھا آیا، تخت تو نے پا لیا
کیا کہا، اسلام کی فطرت بھی تجھ پے بار ہے
طاعتِ نفسی نے تجھ کو کر دیا بے کار ہے

اب فسانے عشق کے اپنے ذرا تو ہم سے سن
استعارہ، مے کا لا کے، گا رہا تو جس کے گُن

پھر گلہ ہم سے کہ اتنا درد کیوں جذبوں میں ہے
حسن حدت میں نہیں، تحقیر کے حربوں میں ہے
حسن کی مسند پے کچھ افراد کیوں بیٹھے ہوئے؟
سنگ جیسے دل ہیں ان کے، چال میں اینٹھے ہوئے

کیا تجھے اب میں بتاؤں، ہے کہانی پیچ دار
حسن کے ادراک میں تیرا نہیں ہے اعتبار
تیری کُل دیوانگی بس کاکل و رخسار میں
کیا یہی اوصاف ہوتے عشق کے بیمار میں؟

تو نے ہے مسند سجائی حسن والوں کے لئے
راہ یوں ہموار کر دی دل کے کالوں کے لئے
معذرت میری، میں تیرے عشق کا قائل نہیں
بے طلب تو در پے آئے تو کہوں سائل نہیں
تیرے جذبے ہوں جو سچے تو مسیحا وقت ہے
قُم ذرا تو بول، جی اُٹھے گا جو دو لخت ہے

اب بھی گر تجھ کو شکایت، منہ تو مجھ سے موڑ لے
اس فلک سے، اس دھنک سے سارے رشتے توڑ لے
لوٹ آیا پھر بھی تو سب در کروں گا تجھ پے وا
پھر سجے گی ساری دنیا تیری خاطر بے وفا

پردیس

جا رہا ابا مجھے کھاتی ہے فکرِ روزگار
گھر میں چولہا بجھ گیا ہے رنج و غم ہیں بے شمار

آپ بس مرے لیے ہر پل دعا کرتے رہیں
ان دعاؤں پر ہی بقیہ عمر کا ہے انحصار

جا رہا کس دیس کو تُو چھوڑ کر یہ سر زمیں
کیا ہے دولت اس قدر لازم، جھکا لے تو جبیں

کیا نہیں اپنا وطن تجھ کو معزز میری جاں
یہ دیانت خون میں، رشتوں کا یہ سود و زیاں

میرے ابا سب دیانت مال کی محتاج ہے
کس نے تیرا گھر چلایا یہ جو حالت آج ہے

یہ فلاحی اک ریاست ہے شمالی اور میں
مال و دولت کی امیں ہے مفلسی کے دور میں

دیس ہیں اپنے سبھی، کیا تُو قدامت بولتا
کیوں کرے کفران نعمت کا، جو رب در کھولتا

میں وہاں جاؤں زرِ تبدیل آئے گا یہاں
سوچ تو، کیا برکتیں ہوں گی وطن پہنچے کہاں

میرے بیٹے جن کی خدمت تو کرے گا، غیر ہیں
مال کو کیوں رو رہا تُو، یہ سمے کے پھیر ہیں

غیر کو میں گر نمونہ بن دکھاؤں زُہد کا
کیا نہیں حق میں ادا کر پاؤں گا یوں جُہد کا؟

تو نے بیٹا عمر اک میرے صحن میں بسر کی
میں نے نہ دیکھا نمونہ جُہد کا، کیا کسر کی

یہ تری اپنی زمیں ہے اس کا تجھ پے مان ہے
چلتا پھرتا ہے اکڑتا دیکھ تو کس شان سے

نہ تُو زر تبدیل کرکے اپنی عشرت کو بڑھا
من میں تھوڑا کر تغیر، جی کے عسرت میں دِکھا

کس ثقافت پر کرے گا پرورش بچوں کی تُو
کس کے سینے جا لگیں گے جب چلے گی گرم لُو

کیا تُو سن پائے گا پنج وقتہ اذاں پردیس میں
کیا ترا حُلیہ بنے گا تُو پلا کس بھیس میں

کیا نہیں ہے فرض تیرا، دین کی خدمت کرے
یہ وہاں ممکن نہیں کے ایسی تو ہمت کرے

تیرا درجہ دوم ہی ہو گا اگر ہو بھی گیا
عمر بھر تو نیند کو ترسے گا گر سو بھی گیا

میرے ابا تو نہیں واقف کہ اب طورِ جہاں
وہ نہیں ہے تُو سنا کرتا تھا جو شورِ زماں

میں غلامی کو ہوا راضی ہوں ان احوال میں
لوٹ آؤں گا میں واپس، تین یا دو سال میں

وہ نہیں تکریم کرتے ناسمجھ ہیں اصل سے
جانتا اُن کی عداوت مسلماں کی نسل سے

لے تری داڑھی ہے پکڑی مُجھ کو دے دے تُو دعا
مسکرا کے کر مجھے رخصت مرے پیرِ ردا

تُو مرے بچے نہیں سمجھے گا میری زار کو
مان لوں گا میں ہمیشہ کی طرح اِس ہار کو

کرکے جا یہ عہد میت تو مری دفنائے گا
اپنے بچوں کو مری تصویر بھی دِکھلائے گا

جا حفاظت میں رہے ربِ جہاں کے ساتھ میں
جو متاع بھی مانگ لے تُو ہو وہ تیرے ہاتھ میں

قبر پے ابا کی سب گاؤں کے باشندے جھُکے
سال جو دو تین تھے، دو تین عشروں سے رُکے

بیٹی

گھڑی ٹِک ٹِک چلی جائے
مرے ماتھے پے کچھ بُوندیں
مرے گالوں پے دم گُوندیں
تمنا تھی، خوشی تھی، بےقراری کی گھڑی وہ تھی
نئی اک زندگی تھی، موت کے پہلو کھڑی وہ تھی
مبارک ہو تمہیں بیٹی
وہاں جھولے میں وہ لیٹی
تمنا یا خوشی یا خوف ہے، یہ کیا کہانی ہے
خبر یہ کِس نے دی مجھ کو، کسے میں نے سُنانی ہے
زباں ہونٹوں پہ مَلتی گود میں میرے پڑی تھی وہ
مرے ہاتھوں سے چھوٹی پَر اُمنگوں سے بڑی تھی وہ
یہ کہتی تھی
مجھے گھُٹی پلا دو اور

وفا میری خرید و بخت کی قیمت لگا دو
زباں جذبوں کو دے سکتا تو میں اِک فاتحِ عالم
نظر میں گر بصیرت ہو، حظِّ عظمت کا در پیہم
مرے گھر کی مہارانی۔۔
جو قدموں پر کھڑی ہوتی تو راہیں نُور کر دیتی
ادا جب حرف ہوتے، پھول بن گرتے
مری سب اُلجھنوں کو دُور کر دیتی
بھری جو نیند سے آنکھیں
انہیں مخمور کر دیتی
فقط بابا کے مطلع پر
مری چاہت کو یوں مجبور کر دیتی
کہ جیسے پیاس میں پانی کا اک پیالہ
ہو ریگستان میں گل بھی گلِ لالہ

مرے گھر کی مہارانی۔۔
مری بیٹی مجھے دے ڈر
بنے دل واہموں کا گھر
یہی ڈر ہے، متاعِ زندگی، جینا سکھاتا ہے
غموں کو گھول کے اشکوں میں یہ پینا سکھاتا ہے

نہیں ہوتی کبھی بیٹی
کسی کم ظرف کا ورثہ
کہ رکھتی وہ ہمیشہ ہے
دعاؤں میں مرا حصہ
کبھی نظروں میں جو جھانکوں
حیا کا اک نیا قصہ
کبھی میں ڈانٹ دیتا تو محبت کا بدل لیتی
توجہ دے نہ پاتا تو مروت کو مسل لیتی
مری بیٹی بڑی ہو کر
مجھے چھوٹا نہ ہونے دے

کبھی اس کی دلیلوں میں
مجھے کھوٹا نہ ہونے دے
مری بیٹی۔۔۔
غزل کا ایک عنواں سعد کو مغموم کر دے ہے
کہ بیٹی کو کوئی کیسے، بھلا مقسوم کر دے ہے
مگر اک دن ہے سب کو بیٹیاں جب چھوڑ جاتی ہیں
کتابِ زندگی میں ورقِ اُلفت موڑ جاتی ہیں
زمانے کی سبھی خوشیاں ہر اک ثروت

تمہیں لوٹا کے بندھن توڑ جاتی ہیں
قسم مجھ کو مرے رب کی کہ تم پھر پا نہیں سکتے
حلاوت زندگی میں پھر کہیں سے لا نہیں سکتے

مقصدِ حیات

بھٹکا ہوا مسافر میں زندگی کے بَن کا
ماتھے پہ تھی سیاہی سچا مگر تھا من کا
خالق سے پوچھتا تھا میں زندگی کا مقصد
طالب نہیں ہوں عشرت کا، نے فقیر دھن کا

ہر رات اپنے رب سے ہُوں خلوتوں میں گویا
میں طالبِ ہدایت میرا شعور سویا
سجدے میں سر گِرا لُوں یہ تو مجھے خبر ہے
پَر فکر میں جہالت کا ہم نے بیج بویا

کچھ وقت نے سمیٹا اور وہ مقام آیا
اول ملائکہ کا سجدوں میں نام آیا

کِس نے تجھے سِکھائی بے وقت کی ریاضت
کیونکر نہیں نمازوں میں ہے قیام آیا

بھر فکر کی عمارت میں اور اینٹ گارا
اب دے نکال باہر دنیا کا ذکر سارا
تُو مجھ کو پانا چاہے تَو آرزو بڑھا کچھ
سچی طلب ہو من کی گرداب میں سہارا

میں بخت کا بھلایا صحرا نشین ٹھہرا
چھوڑی زمین اپنی بَن کا مکین ٹھہرا
سب گردشِ زمانہ میری پہنچ سے دُور اب
دِل سے اُبھرتا ہر غم لوحِ جبین ٹھہرا

اِک طائرِ قفس نے مجھ سے جواب مانگا
جو راحتّیں میّسر ان کا حساب مانگا
کیوں بے خودی کے ہاتھوں اپنی خودی گنوائی
میری کہاوتوں کا مجھ سے نِصاب مانگا

معروض جو سنی تو دِلدوز آہ نکلی
وحدت ہو جس پہ قائم اک ایسی راہ نکلی
اُلفت کی بات بانٹو، اُمت میں عام بانٹو
منکر ہو پابجولاں ہر ایسی چاہ نکلی

نسخہ جو کیمیا ہے امت سے دور لے جا
ستّر عُلوم میں جو ماہر ہیں ان کو دے آ
نے اب جہاد واجب نے روحِ مردِ مومن
اپنے طریق کی لَو، اربابِ غیر سے لا

کیا علم کی حقیقت، کیا راست فلسفہ ہے
یہ بحث اب نہیں ہے، میرا کہا بڑا ہے
سب عشق کی منازل ہیں ضرب میں مُقیّد
باہر ہے جنگ جاری یا کال ہی پڑا ہے

اُس وقت ذوقِ ایماں جھجھوڑے جا رہا تھا
سچی لگن تھی مالک رستہ دِکھا رہا تھا
جو ڈھونڈنا ہے مجھ کو تو آنکھ کھول دِل کی
میں کب سے منتظر تھا، منزل سجا رہا تھا

دشتِ دہر میں صحرا، جنگل تمام گھومے
تم طرزِ فکر و مستی ہر رنگ میں ہے جھومے
مقصد حیات کا ہے قرآں کی سورتوں میں
قدموں کو مصطفیٰؐ کے، تیرا طریق چومے

قرآن سے چمٹ جا، سب زیروبم ہیں تیرے
قرآن سے لپٹ جا، جاہ و حشم ہیں تیرے
ادنٰی مقامِ فانی ہر گز نہیں ہے منزل
گر اُس سے فقر لے لے، 'لوح وقلم ہیں تیرے'

قرآن کو تو سیکھا، قرآن کو تو جانا
تصدیق بھی ہے لازم، ایمان بھی ہے لانا
کردار کا محافظ، اوصاف کا مصدق
یہ تب بنے گا اس کے جب سب حقوق مانا

قرآن ہی زماں کا حاصل بیان کر دے
بندے خدا بنے جب، عبرت نشان کر دے
قرآن ہی تغیر قرآن ہی تبدل
متروک حق کہیں ہو، قرآں جوان کر دے

درویشی اِک مَنش ہے قرآن کی فُغاں میں
جب تک نہ ہو مُیسر قوت تجھے جہاں میں
کندن تجھے بنا دیں جب وقت کے تھپیڑے
باطل سے کر تصادم قرآن کی زباں میں

لو مل گیا قرینہ مسلم کو زندگی کا
کچھ تو سمجھ میں آیا اسلوب بندگی کا
اب زندگی لگا دو، اب زندگی کھپا دو
تو ہو جو خود شکستہ، حصہ ہے پختگی کا

غزل

زندگی ہے تلاش میں شاید
دیکھتا ہوں بھٹک رہی در در

'یہ نہیں تھی کبھی مری غایت'
آ نکل جسم سے، اے دیدہ ور

ہے خودی سے مری بہت الفت
دیکھ مجھ پر انا کا جادو کر

بیچ دے دل کے سارے ہی ارماں
خواہشِ دید کا نہ ہووے ضرر

چھین لے کچھ جہان سے فرصت
رُوح کے سنگ ہو کچھ وقت بسر

جو حقیقت کو بھی ہے دیکھ سکے
ظرف میں ڈھونڈ ایسی تیز نظر

پی لیا ماپ کے سبُو میں جام
رسمِ اُلفت کی نہیں تجھ کو قدر

نفس کی آگ نہیں بُجھتی گر
قلب میں عشق کی بھڑکا لے شرر

تھک گئے بھاگ کے تو علم ہوا
یہ ذرا فصل پہ موجود مفر

اشک کیا غم کو ہے عنوان کرے؟
دھو دیا دھوکہ و فریب، مَکر

سعد بھی شعر میں سماں باندھے
کون آگے چلے بنے رہبر

کانووکیشن

سیاہ چغے ، وہ لمبی ڈوری
سلگتے جذبوں کی وہ تجوری
سپاس نامے پہ نام کس کا ؟
اٹکتا لہجہ ہے جام جس کا
وہ جس کا بستہ کتاب بوجھل
وہ جس کی ہستی شباب بوجھل
وہ جس کی آنکھیں سراب بانٹیں
صباحتوں کے حباب بانٹیں
نکلتا گھر سے تو حسرتوں میں
تھکا ہوا جب وہ گھر کو آتا تو ظلمتوں میں
اٹھائے پھرتا حسین خوابوں کی ایک دنیا
رہا وہ باغی تھا نیند کا بھی
کہ رات ہوتی تو سو نہ پاتا

جو خواب میں تھا سماں، حقیقت میں ہو نہ پاتا
جنابِ عالی، حضورِ والی وہ جس کا تکیہ کلام ہوتا
وہ سب کو چوٹی سلام کرتا، نہ اُس کو چوٹی سلام ہوتا
عجب ہیں جذبات آج اُس کے۔۔
لباس اُجلے، یہ محفلِ رنگ
سب ہی مکاں کے مکیں بھی ہیں سنگ
وہ میری اماں، عجب تفاخر نگہ میں رکھے
جھکائے کاندھے وہ میرے ابا، دبائیں خوشیاں
مطیعِ ذیشاں بطورِ عصیاں
کہ آج خالی ہیں اُن کی آنکھیں
اور اتنی خالی کہ بس خوشی کو سمیٹے جائیں
نہ ان کے چہرے پہ کوئی اُلجھن، نہیں رواں کوئی سیلِ ترحم
یہ سوچتا ہے۔۔ کہ سرخ قالیں مرے لیے ہیں؟
مرے قدم سے یہ سرخ قالیں، کُچیل مٹی سے بھر نہ جائیں
غلط کہے سے مروتوں کے حسین جھرمٹ بکھر نہ جائیں
وہ میرے رہبر۔۔ وہ میرِ محفل کچھ ایسے مجھ کو وہ دیکھتے ہیں
بڑے تحقق سے کھوجتے ہیں
تنی ہوئی سی بھنوؤں میں چھپتی ہوئی تمنا
امیدِ پیہم سے ٹمٹماتی ہوئی ثریا

سلامِ الفت سبھی کو میرا۔۔
اگر تصور ہیں وہ تو تصویر ان کی میں ہوں
اگر قدر گر ہیں وہ تو تقدیر ان کی میں ہوں
دہر میں جادوگری کا دعوٰی میں پھر سحر ہوں
غلاف شب کا اگر ہیں وہ تو میں اک پہر ہوں
خوشی سے تالی کو پیٹے جائیں
کئی اُمنگیں گھسیٹے جائیں
بلا رہے منج پے مجھے وہ

سپاس نامہ سنایا جائے
وہ ٹکڑا کاغذ کا آج مجھ کو تھمایا جائے
یہ ٹکڑا میری ریاضتوں کا بدل نہیں ہے
حصولِ منزل نصیب ہو تو
فنونِ رعنا کیے جو حاصل
انہیں یوں بے مول عہد و پیماں میں تول دینا نہیں ہے آساں
نہیں یہ ٹکڑا دلیل میرے علوم وفن کی
کہاں ہے اس پر کوئی بھی تحسین میرے من کی
جو میں نے جانا جو میں نے سمجھا یہی ہے وہ بس
کہ مجھ سا دوجاز میں پے بستا کہیں نہیں بس

سروس

مدد مطلوب ہے کیا سَر۔۔؟
مدد مطلوب ہے کیا سَر۔۔؟
مری ریڑھی پے سب کچھ ہے
جو ہو مطلوب ملتا ہے
مرے چہرے کے رنگوں سے کہیں رنگیں
بہت کھانے ہر اک مشروب ملتا ہے
جو خبریں جاننی ہوں قوم کی بین الممالک کی
تو اخباریں رسالے ساتھ میں مندوب ملتا ہے
بہت عمدہ مصالحے والے گپے ترش پانی میں
بقر تِکہ خوب ملتا ہے
مگر اے صاحبِ زر، صاحبِ ثروت
خُدارا جلد فرمادیں
کھڑی ہوں میں، سرِ بازار

بہ صورت مرمریں فن پار
بہت مجھ پے نظر کے وار
کہ جیسے اُڑ رہا شِکرا
جھپٹنے کیلئے تیار
نہیں اُلجھن، یہ ڈر ہے جو
میری پلکوں سے ہوتا پار
میں کیسے وہ بیاں کر دوں
نہیں ہے آپ کو جو ڈر
مدد مطلوب ہے کیا سَر۔۔؟
مدد مطلوب ہے کیا سَر۔۔؟
مرے صاحب قسم لے لو
کسی کی گود میں پل کر
کسی شانے پہ سر دھر کر
کسی ممتا کی اُلفت میں
کسی پرنم سی فُرقت میں
یہاں خدمت کو پہنچی ہوں
جہاں سکے کمانے کو
کسی ریڑھی پے خواہش رکھ
صدا دیتی ہوں جو ہر بھر

مدد مطلوب ہے کیا سَر ۔ ۔؟
زمیں بنجر پڑے جو دل
میری مُسکان سے مائل
مجھے اوڑھے مری ہمزاد
بھٹکتی پھر رہی در در
مدد مطلوب ہے کیا سَر ۔ ۔؟
مدد مطلوب ہے کیا سَر ۔ ۔؟
میرے پیارے ۔ ۔ ۔
عقب کی سیٹ پہ دیکھو
نگہ صاحب کی ہے وہ کس قدر بھوکی
کبھی اِک آدھ لمحے کیلئے بھی تو
نہیں مجھ سے ہے وہ چُوکی
مجھے شاید ۔ ۔
وہ ساتھی کہلوانا چاہتا ہے نا
یا پھر شاید
مجھے بیٹی بنانا چاہتا ہے نا
مگر کیسا بگولہ سوچ کا اندوہ ہے کہ جو
مجھے میری نگاہوں میں گرانا چاہتا ہے
بہکتی ہوں، بہلتی ہوں

لگا کے موم کے یہ پر
مدد مطلوب ہے کیا سَر۔۔؟
مدد مطلوب ہے کیا سَر۔۔؟
ذرا ٹھہریں مجھے اس نے بلایا ہے
مجھے اب اُس کو جانا ہے
ذرا میں طول دوں باچھوں کو، اِک مُسکان سی بھرلوں
کہ رائے کو بڑھانا ہے
ذرا کچھ غور فرمائیں
کہ جب میں اُس کے پہلو جا کھڑی ہوں گی
ہوس آنکھوں سے مِٹ کہ لفظ میں خوشبو کی صورت یوں
مجھے لوٹائی جائے گی
کہ جیسے سوچ میری واہموں پہ بان بنتی تھی
نہیں تھا راگ کوئی سر، میں یوں ہی تان سنتی تھی
کہاں تک یوں جئیں گے ہم؟
کوئی بہروپ ہے کیا سَر؟
مدد مطلوب ہے کیا سَر۔۔؟
ہے مدت ختم ہونے کو
سفر آلائشوں کا پَر نجانے کب ختم ہوگا
دوا لینے کو جانا ہے

وہاں بھی آزمانا ہے
تجھے شربت پلا دوں بس
پھر اماں جان کو دارو پلانا ہے
ہے مدت ختم ہونے کو
سمیٹیں سب سماں اپنا
بلاتے سب۔۔۔مری اماں
نظر عاقب۔۔۔
خدارا اب تو بتلا دیں
ہمارے واسطے کوئی مطب ہے کیا؟
کسی کو ہم سے بھی کوئی طلب ہے کیا؟
خدا حافظ مرے صاحب!
رہیں گے منتظر ہم پھر۔۔
خدا حافظ مرے صاحب

وقت

وقت اِک فاصلہ یا ایک وُجود
ہے تسلسل کہ فقط ہے یہ جمود
کیا یہ چلتا ہے، واقعہ ہے رُکا
یا یہ ہر واقعے پے عین عمود

کیا اِسے ماپتی ہے ہاتھ گھڑی؟
یا گھڑی اِس کی منتظر ہے کھڑی
کیا یہ محروم ہے توجہ سے
یا ہر اک روح کو اِسی کی پڑی

کیا یہ ہے ''جزو''، ''کُل'' زمانہ ہے؟
یا زماں کا یہی فسانہ ہے

یہ نہ ہو گر تو زندگی کیا ہو؟
فلسفی کا یہیں نشانہ ہے

وقت کا جسم ہے نہ جان کوئی
ہے مسلسل کہ جیسے تان کوئی
نہ یہ حرکت میں ہے نہ ساکن ہے
پَر نہیں اِس کے بِن اڑان کوئی

وقت اِک مضمحل حقیقت ہے
وقت وِجدان ہے، بصیرت ہے
کر رہا عبرت اور آس بیاں
خالق و خلق کی یہ سیرت ہے

ہے تخیل کے درمیاں کا سکوت
امرِ باطن پہ پیش رکھے قنوت
یہ عناصر کے کھیل کا ساتھی
ہر تغیر کی بے کلی پے ثبوت

اس کے سائے میں پل رہا باطل
یہ جو قائم تو تخت بھی قاتل
قبل اس کا نہیں کہیں موجود
اور لاہُوت بعد میں واصل

وقت، ترتیب واقعات میں ہے
عکس بھی اصلِ کائنات میں ہے
کرتا تصویب ان حوادث کی
نام ما فوق الطبیعات میں ہے

کہیں تذکیر دہر سے اس کی
کہیں تعبیر قصر سے اس کی
نیل کے اضطراب کا مُجرم
گاڑھی چھنتی ہے عصر سے اس کی

ہے ابھی حال، اب ہوا ماضی
کس قدر اختیار پر راضی
حال کرتا ہے کیسے استقبال
اس گھڑی کا، جسے کہیں ماضی

وقت کی سعد نے سنی جھنکار
لازمی ہو گیا ہے چین قرار
مانے ہے ''جزو''، نہیں ''کُل'' پھر بھی
ہے کبھی محو، کبھی ہے بیزار

شہداء بچوں کے نام

خُدا کی قسم میں نے نوحے سُنے ہیں
خُدا کی قسم میں نے نوحے سُنے ہیں

کہ نوخیز جسموں کی حالت تھی خستہ
کہیں ایک جُوتی، کہیں ایک بستہ
کہیں جاں دریدہ، کہیں دل بُھنے ہیں
خُدا کی قسم میں نے نوحے سُنے ہیں

تبسم تھا قاتل، جو ہونٹوں پے رقصاں
کھلا سا وہ ماتھا کہ جس پے یہ چسپاں
ہمارے لئے تم نے جالے بُنے ہیں
خُدا کی قسم میں نے نوحے سُنے ہیں

بِلکتی ہوئی ماں جو آتی کفن پے
دہلتی زمیں بھی جواں اک بدن پے
تھے کُرتے وہ اجلے جو خوں سے دُھلے ہیں
خُدا کی قسم میں نے نوحے سُنے ہیں

نکلتے ہوئے گھر سے 'اماں' پُکارا
نہیں آج جاؤں گا کہہ کہہ کے ہارا
خُدا را تو لوٹ آ، مرے در کُھلے ہیں
خُدا کی قسم میں نے نوحے سُنے ہیں

جو آگے ہے بڑھنا تو محنت کروں گا
وطن میں جیوں گا، وطن پے مروں گا
یہی خواب آنکھوں میں مٹی گُھلے ہیں
خُدا کی قسم میں نے نوحے سُنے ہیں

قلم کی سیاہی میں سُرخی ملا دی
جو جذبوں کی حدت تھی،شدت بنا دی
ملامت کہ اب بھی کئی سر دُھنے ہیں
خُدا کی قسم میں نے نوحے سُنے ہیں

کہیں سعد بھی اُن کے پہلو کھڑا تھا
کسی پھول پہ ایک کتبہ پڑا تھا
تمہارے لئے ہم جلے ہیں بُھنے ہیں
خُدا کی قسم میں نے نوحے سُنے ہیں

میدانِ محشر سے.....

سو رہا تھا قبر میں وہ چیخ بھی دِلدوز تھی
ہِل رہی تھی یہ زمیں، آواز بھی پُر سوز تھی

بن پتنگے اُڑ رہے تھے لوگ میرے چار سُو
اُڑ رہے ایسے جبل تھے جیسے چلتی گرم لُو

ایسے عالم میں کوئی چہرے بہت تھے تابناک
باقیوں کے بال اُلجھے، خاک آلودہ تھی ناک

بج رہا تھا اک نقارہ، اس طرف کو آیئے
کیا تھا بویا، کیا ہے کاٹا، گوشوارہ لایئے

ہائے تھی بس ہر زباں پہ حسرتوں کا راج تھا
ہر گھڑی تھے جس کا سُنتے ، حشر برپا آج تھا

پاؤں بوجھل ہو رہے تھے، دل پہ کوئی شور تھا
جو تھا سوچا وہ نہیں تھا یہ تو قصہ اور تھا

ایک صاحب تھے جلالی اور تھے مامور بر
انتظامِ روز و شب پر، محشر و میزان پر

میں نے پوچھا ان سے ربِ دو جہاں کب آئیں گے
کیا ہمارے عیب سب کے سامنے دکھلائیں گے؟

وہ جو فانی دار تھا اُس میں کہاں تھے یہ سوال
آج یومِ دین ہے، اُس نے کہا، اب کیا ملال

عالی جاہ میں وقت ہی نہ پا سکا، میں کیا کروں
بھیج دیں واپس اگر، پھر میں جیوں، پھر میں مروں

تو خدائی پھر کرے گا لوٹ بھی جائے اگر
حضرت انسان ہے تُو کی جس نے روح بھی دربدر

میں مسلماں اس جہاں میں، مجھ پے ہو وا کوئی باب
آج سب ہیں ایک صف میں، سب کا ہو گا احتساب

اُس کی رحمت کیلئے میں ہاتھ بھی پھیلائے ہوں
عدل ہے اُس کا وطیرہ، تُو بھی کر لے سرنگوں

سب کیا ہے اور دھرا ہے میں نے یہ تشخیص کی
بات چھیڑوں یا نہ چھیڑوں اُس لعین ابلیس کی

جان کے وہ چال میری مجھ سے یوں گویا ہوا
جاگتی تیری خودی پر نفس ہے سویا ہوا

یہ پرانی چال تو اوروں کو جو الزام دے
آج سب کچھ مُنکشف ہے، نے کسی کا نام لے

کیوں نہیں سمجھے ہیں کہ میں کس قدر مجبور تھا
غم تھے مجھ پر اتنے گویا میں تھکن سے چُور تھا

میں نے اپنی کُل متاعِ زندگی تھی نام کی
تُو سنائے رام لِیلیٰ دکھ بھری، آلام کی

جا، نہ میرا وقت لے کہ تُو بہت بدنام ہے
کوچہء یاراں میں ترے سر ہر اک الزام ہے

میں چلا آگے وہاں سے ، اک جہاں ہی اور تھا
سب تھے اُڑتے پھر رہے اور اک غضب کا شور تھا

اک جگہ پر تین صاحب گفتہ نا معتوب تھے
علمِ دیں، جاں آفریں اور زُہد سے منسوب تھے

کیوں لیا تھا علم، کیوں دی جان جانِ آفریں
کیا تیرا تقوٰی تھا زاہد اور کہاں تیری زمیں

مالکِ دونوں جہاں بس تُو مرا مقصود تھا
تیری خاطر کٹ مرے تھے، تو مرا معبود تھا

تو ہوّائے نفس کو خود سے نہ کر پایا جُدا
اپنی پُوجا کر رہا تھا، تو ہی تھا تیرا خُدا

لے چلو اِن کو، نہیں اِن سے کریں کوئی کلام
جھونک دو اِن کو کہ اِن کے درد کو اب ہے دوام

دو قدم آگے بڑھا، وہ حسرتِ پیہم کِھلی
عرش کے سایے میں جن کو سلطنت جم کی ملی

میں نے پوچھا، کیا کیے ہو اُس جہانِ سنگ میں
عدل تھا کلیّہ ہمارا، دائمی ہر رنگ میں

تُو نے کیسے پا لیا سب تُو تو ہے اک نوجواں
لو لگائی رب سے اپنے چھوڑ کے سارا جہاں

کیا ترا تھا وصفِ دائم اُس جہاں میں کیا تھا طَور
دل مرا ہر دم بلاتا تھا مجھے مسجد کی اور

وہ بھی تھے اُس گھر میں رہتے جن کا رشتہ بس یہی
وار دیتے رب کی خاطر ایک دُوجے پر خوشی

میں یہاں ہوں مجھ پہ خود کو پیش کرتی تھی وہ حُور
وہ نگاہیں روح سے مجھ کو نہ کر پائیں تھیں دور

میں تو صاحب مال یوں اِس ہاتھ سے دیتا رہا
جان نہ پایا مجھے جو مال تھا لیتا رہا

ایک تھا گوشہ نشیں، سب سن کے اُس نے یوں کہا
ایک لمحہ تھا کہ رب کے خوف سے آنسو بہا

ہم بہت مشکور ہیں اس جُود پر رحمان کے
کیا بتائیں کیا تھا عالم بعد اِس اعلان کے

پھر زمیں کانپی کہ اک چنگاڑ سی اُٹھی کہیں
یوں تھا لگتا ڈھانپ لے گی ہم کو یہ خلقت یہیں

زورِ حدت بڑھ رہا تھا، جان جیسے جا رہی
تھام لو سب سانس کہ وہ ہے جہنم آرہی

سب گرے سجدے میں اپنے رب کے، یہ منصوب تھا
تجھ سے دنیا میں یہی سجدہ تو بس مطلوب تھا

توڑ کے سب ضبط عورت پھینک دے جیسے حمل
خوف ایسا کانپتے تھے اُس گھڑی اصحابِ حل

عرش سے آئی صدا کہ کون ہے مسجودِ قوم
پیش ہوتی دِکھ رہی تعبیرِ لِمَنِ المُلکُ الیوم

اک منادی اب ہوئی اقدام نہ ہِل پائیں گے
جب تلک یہ پانچ نکتے سب سے پوچھے جائیں گے

کیا تھا مقصد زندگی کا اور جوانی کا کمال
علم پر کتنا عمل تھا اور حسابِ کسبِ مال

کیسی یہ دُنیا ہے یارب، کیا کڑا ہے احتساب
دل کہ الجھا جا رہا ہے دے نہیں سکتا حساب

کیا بتاؤں زندگی ادنیٰ غموں میں گُھل گئی
علم تھا پیشہ، عمل کی سب حقیقت گُھل گئی

میرے مولا کیا نہیں ممکن عدم ہو جاؤں میں
جس سے تُو نے سب سکھایا وہ قلم ہو جاؤں میں

تھے سوالِ آدمیت پر جوابِ بے کراں
رحم مالک، رحم مالک ایک ہی آہ و فُغاں

پھر تھا منظر سب کھڑے میزان پر تھے صف بہ صف
بے لباسی تھا مقدر، شاکلہ تھا سر پہ لف

ضابطہ تھا عدل کا ایسا نہیں دیکھا کبھی
بے نتیجہ جو سعی تھی، مان لی وہ بھی گئی

گفتگو جو رات کی تنہائی میں کی رب سے تھی
سُرخیوں میں وہ لکھی تھی، بات جانے کب کی تھی

وزن جو تُل جاتے تو پھر ضرب کھاتا شاکلہ
کم وزن بھی تھے سرِ صف کیا عجب تھا معاملہ

آنکھ پتھر، دل محو تھے، حلق تھے سُوکھے ہوئے
کیا حکم مجھ واسطے، سب نفس تھے بُھوکے ہوئے

نہ کوئی اولاد تھی، نہ اقربا، نہ یار تھے
سب نے آنکھیں پھیر لیں ہر اک پہ اپنے بار تھے

کچھ تھے اصحابُ الیمیں جو بھاگتے تھے جھوم کر
ہاتھ پکڑا ایک پرچہ دیکھتے تھے چُوم کر

دوڑتے تھے باغِ اُلفت کو خوشی سے تھے نہال
اُن کا ماضی کرب سے بھرپور تھا روشن تھا حال

اور درِ جنت پہ سب یوں اُن سے چمٹے جاتے تھے
آرزؤں کی فصیلوں پر انہیں لے آتے تھے

کس کو ملتی کامیابی، سوچتا ہوں یہ کھڑا
ہو رہے ذیشان، آثم، میں ہوں اُلجھن میں پڑا

بس یہی جانا کہ جو بندہ تھا وہ ہے کامیاب
جو خدا بننے کو آیا تھا رہا وہ بے حجاب

میں نے اک سے یہ کہا مجھ کو بھی تو دِکھلایئے
کیا ملا تم کو یہاں، ہم کو بھی لے کر جایئے

صد شکر کہ اک طرف اُس صاحبِ خوش بخت نے
تخت دکھلایا، کِیا مدہوش مجھ کو تخت نے

یہ نگاہِ بے بصیرت سب بُھلا کے جائے گی
اِس کی حد ہے بس یہاں تک، اب نہیں سہہ پائے گی

اِس تصور سے میں نکلا، جب لگی میری صدا
آیئے میدان میں سن لیں ذرا تیری دعا

رعب تھا ایسا کہ لفظوں میں بیاں ہو گا نہیں
روک لے کوئی مجھے جانا وہاں ہو گا نہیں

دست بستہ، سر جھکائے، بارگاہِ رب میں تھا
علم تھا تجھ کو سکھایا پھر بھی شامل سب میں تھا

بول تُو اب، کیا عقیدہ سینچ کے لایا ہے تُو
عشق ہے توحید سے یا شِرک کا سایہ ہے تُو

صد شکر ہے میرے مولا، شرک سے میں دُور تھا
لاکھ مجھ میں عیب ہوں گے پر تیرا مامور تھا

شرک کیا ہے، سر جھکانا بس درِ اصنام پر؟
یوں نہ اپنے نفس کی تحریر کو تُو عام کر

مال پُوجا، نفس پُوجا، شاہ کو پُوجا تو نے جب
کیا مری توحید کا اثبات تھا یہ طور سب؟

یا میرے مولا، یہ واحد تھا سوالِ زندگی
سوچتا تھا یہ میری نُصرت کرے گا اُس گھڑی

اب بتا دے کیا عبادت کے ترے اوقات تھے؟
کیا خُشوع اور کیا خُضوع تھے، کیا ترے جذبات تھے؟

تُو ہے اکبر، شان کے لائق نہیں میں نے کیا
بندگی کا ضابطہ اوروں سے تھا میں نے لیا

دیکھ تُو اپنی نمازیں، دیکھ نیت کا جلال
وہ وہاں پر سب کُھلا ہے جو کیا تُو نے کمال

کس کے لکھے پر بنائے تُو نے غِل سے پُر رواج
کیا مرے دیں میں وہ سب تھے، تُو نے پہنے تھے جو تاج؟

فکرِ فردا تھی ترا ہر زاویہ، ہر آن کوش
ملتِ بیضا کے معنی پر نہ رکھ پایا تو گوش

تُو بتا تو کیا ترے اعمال ہیں کہ رحم ہو
دیں کے غلبے کی جُہد کی؟ کھول تو کچھ فہم کو

کیا مرے بندے ہیں راضی، اُس پے جو تُو نے کِیا
وہ مرا کُنبہ ہے جس کو تُو نے بے گل کر دیا

تجھ کو سونپا تھا میرے محبوب نے فرضِ زماں
ہاتھ سے روکا تھا مُنکر یا کہ کھولی تھی زُباں؟

دِکھ رہا تھا اُس گھڑی انجام اپنا سامنے
اب یہاں پر کون آئے ہاتھ میرا تھامنے

کُچھ ترے اعمال ہیں جو، ہیں شبینہ روز میں
تُو بہت رہتا تھا نادم اُس جہانِ سوز میں

تُو نے ہر دم چاکری کی مہر کی محتاج کی
عین ممکن حق میں تیرے ہو یہ محفل آج کی

اک جگہ پے بیٹھ کے میں رو رہا، بے یار تھا
ہر طرف تھی نفسا نفسی، یہ عجب بازار تھا

پھر یکا یک اک طرف کو ساری خلقت بھاگتی
جیسے پہلے نیند میں تھی اب ہے ملت جاگتی

آ رہی تھی اک سواری عرش کے اطراف سے
جس کے ہاتھوں میں سواری وہ لدا اوصاف سے

ایک نعرہ تھا نگاہوں کو جھکا لو سب وہاں
یا رسول اللہ کرم ہم پر کرا دو اب یہاں

آرہے تھے جُوں جُوں آگے، نور یوں تھا پھیلتا
سیر ہر اک ہو رہا تھا، غم کو اپنے جھیلتا

میں نے سوچا، کیا نظر ہم پر بھی ہو گی کرم کی
بوجھ سب کاندھے اُٹھائے، فکر اپنے بھرم کی

حالتِ خلقت جو دیکھی، رحمتُ للعالمیں
گر گئے سجدے میں تر کی آنسوؤں سے وہ زمیں

عالمِ رشکِ ثنا ربِ جہاں کو بھا گیا
تھم گیا سب، رحمتوں کا ایک طوفاں آگیا

سعد بھی اس حال میں آقا کے قدموں پر گیا
اشتیاقِ دید تھا کہ دید پا کہ مر گیا

اِس ٹھٹھک سے جاگ اُٹھا سو رہا تھا جو کبھی
امتِ بے ہوش پر وہ رو رہا ہے ہر گھڑی

دے الٰہی ہم کو محبوبِ خدا کی پیروی
منصبِ اُمت پے فائز ہوں مٹا کے تیرگی

کہے جو حنظلہؓ خود کو منافق
سمجھ لو اس کا ہے ایمان صادق
فریبِ سعد سے بچنا کہ جب وہ
کہے خود کو منافق، تو منافق

داستانِ حسرت

منتظر شام سے در کھول کہ صیادِ صبا
اک گلی کے کسی نکڑ پہ کھڑا کہتا تھا
چاہنے والو! نگاہوں کو جھکا لو کہ یہاں
ایک معصوم سا بھولا سا صنم رہتا تھا

وہ صنم جس کی نگاہوں پے حیا کا پہرا
جس کے آنچل پے تھا عفت کا نشاں بھی گہرا
یوں تھیں پلکیں کہ عقب بُند ہوا ہو جیسے
تھا تکلم کے ہو فرصت سے لکھا اک سہرا

جو نگاہوں کے تقدس کا سزاوار رہا
عشق سے دور رہا عشق کا بیمار رہا

از خطا گر کبھی نظروں کا تصادم ہوتا
رُخِ روشن پہ تمازت کا طلبگار رہا

اک طلب عشق کی، ریکھا میں نہیں تھی تقدیر
خوئے تسلیم سے عاری یوں جنوں کی تصویر
بھولنا چاہوں بھی تو بھول نہیں پاؤں گا
تر تھی اشکوں سے مگر شوخ تھی اس کی تحریر

لفظ تھے خون کشیدہ سا ہو چہرہ جیسے
خط کی ہر سطر پے مفہوم کا پہرہ جیسے
مجھ سے ملنے کی تمنا تھی پری وش نے لکھی
تھی نشاں بوس، کوئی زخم ہو گہرا جیسے

صد تمنا ہے کہ بس حاصل و موجود دِکھے
لکھنے والے نے مقدر میں وہ لمحات لکھے
رات کب گزرے گی کب سحر سپیدا ہوگی
کیا تصور ہو کہ بس آج کی یہ رات کٹے

مضمحل جسم تھا دل تھام کے رستے پے کھڑا
طول رستے کا شبِ ہجر سے دو ہاتھ بڑا
آنکھ اٹھتی نہ اُدھر، پلک جھپکتی نہ اِدھر
وقتِ رفتہ پہ ہے کب سوز سے کچھ فرق پڑا

لفظ خاموش تھے لمحات میں وہ حدت تھی
روح بے چین کہ جذبات میں وہ شدت تھی
تھی شکایت نہ وہاں کوئی حکایت، نہ سوال
بنا اظہار کے اقرار میں بھی جدت تھی

دستکِ در تھی کہ آوازِ سرافیلِ قضا
حادثہ موت بنا، چھین گیا یار وفا
تھا تبسم، نہ تکلف، نہ ہی تکلیف کوئی
ایک مٹھی میں، محبت مجھے تم سے ہے، لکھا

منتظر شام سے در کھول کہ صیادِ صبا
ہر گھڑی درد کی دولت کو ہے نیلام کرے
سونپ کے عقل سرابوں کے دھنی داروں کو
عشق کا کھیل زمانے میں سرِعام کرے

فرعون سے اِک ملاقات

مِلا اک شب میں فرعونِ مصر کو
ملا بیٹے کو پہلے پھر پدر کو
نہ تھا نادم کوئی اپنے کیے پہ
چھپاتا باپ تھا اپنے پسر کو

ہوا گویا میں اُس ظالم سے ایسے
خدا بننے کی کیوں خواہش تھی ویسے؟
نہیں تھا خوف، پھر جی کے اُٹھے گا؟
تکبر ہائے وہ بھولیں گے کیسے

کہ شہرِ مصر کا تو کرتا دھرتا
جہاں انسان سے انساں تھا ڈرتا

نہیں تھا موت کا اک دن معین
ہر اک لمحہ کہ جیتا کوئی مرتا

ارے ظالم تری دنیا تھی کیسی
دھکتی آگ کے انگار جیسی
جو اسرائیل کے بیٹے تھے گبرو
جوانی ان کی کی ایسی کی تیسی

تری کُرسی جمہوری کیوں نہیں تھی
تجھے شُوریٰ ضروری کیوں نہیں تھی
کہاں تھے تیرے مالی گوشوارے
کہ افسر جی حضوری کیوں نہیں تھی

کلیم اللہ سے بھی تیری عداوت
نہ تھی اللہ سے کیا یہ بغاوت؟
تو پھر کیوں نیل کی موجوں کے در پر
تیرے منصب میں آئی تھی نیابت

بس اتنا سن کہ میت مسکرائی
اُٹھائی بات آنکھوں پر لگائی
جھجکتا تھا وہ کیسے بات چھیڑے
میری آنکھوں میں تھی اک رُوشنائی

کہا فرعون نے اے چشمِ حاضر
تیرے اوصاف گویا لعلِ نادر
تری فرعونیت پے میں فدا ہوں
تو مجھ پہ کر رہا الزام صادر

جو مجھ کو یاد ہے تجھ کو سُنا دوں
تیری تاریخ کے کچھ باب لا دوں
مری ذلت تری ذلت میں گم ہے
مرا جی ہے تجھے آقا بنا لُوں

تکبر تھا جو میں قادر بنا تھا
تعصب تھا جو میں جابر بنا تھا
تیری عاجز مزاجی پے میں صدقے
کہ تو تَو ہند کا اکبر بنا تھا

نہیں تھا ایسا قابل، دیں بناتا
کسی عالم سے پھر جائز کراتا
کوئی مُرشد جو تجھ سا مجھ کو ملتا
تو گردن میں بھی کاتب کی کٹاتا

چلو جو اب چلی وہ چال دیکھو
جو گزرے ہیں وہ ماہ و سال دیکھو
ترے حاکم ہیں کس کی مانتے اب؟
نظامِ اندرُوں کا حال دیکھو

ریاضت بھی سجائی جا رہی ہے
تجارت یوں بڑھائی جا رہی ہے
نہیں توہین کی تجھ کو اجازت
ذہانت آزمائی جا رہی ہے

تیری مجلس کو میری یہ ندا ہے
نہیں ہے بادشاہ جو بادشاہ ہے
کہَیں، جو زندگی پہ جان واریں
میرا دیں تو سیاست سے جُدا ہے

کہاں موسٰی کو روکا تھا بیاں سے
ذرا حق پُوچھ تو موسٰی کے ہاں سے
تیری آواز گھٹ کہ رہ گئی جو
حکایت بھی سُنائی درمیاں سے

سپاہی تو نہیں کیا مصطفٰیؐ کا
تھا کارِ سوز سونپا اس جہاں کا
تو کیوں تو حق کی ہے تلبیس کرتا
کہ میں ہوں مر گیا فرعون واں کا

بھنور میں آ گھِرا تھا بر لبِ نیل
بلایا رب کو چھوڑی قال وا قیل
تری میں عاجزی پے واری جاؤں
درِ مُرشد ہے ترا سنگ وا میل

نہیں اب سعد ڈھونڈے کھو گیا جو
سمجھ میں جوں ہی آیا رو گیا وہ
ختم کر، پل رہا فرعون اندر
دُروبیں بعدِ مجلس ہو گیا وہ

سرِ تسلیمِ خم کا تازیانہ
بدل ڈالے نگہ دل، مخفیانہ
خطا پر جو مُصِر، ابلیس ہے وہ
ندامت، آدمیت کا فسانہ

مولوی صاحب

گیا اِک روز میں مسجد، کہا یُوں، مولوی صاحب
نہیں کچھ دلنشیں لہجہ کہ ہوتا دل نہیں راغب

کہاں ہوتے ہیں وہ واعظ، اُٹھا پھینکیں نحوست کو
مرے قلبِ مصور میں بہت سے بت ہوئے غالب

بہت محدود سا ہے آپ کا علمِ خفی، مانیں
نہ مضطر کر سکے دل کو، نہیں ماخوذ کچھ قالب

نہیں منطق فصاحت بھی کہ باتیں لگتی فرسُودہ
پھر اُس پر حسنِ نوبت یہ کہ حق بھی نیم ہی جالب

بہت ہی دب سے جاتے ہیں جو ثروت حال سے مل لیں
یہی دیکھا سدا میں نے، وقار و تمکنت غائب

معطر آپ کی باتیں، تضاد ان میں بہت لیکن
مجھے لگتا ہے سب کچھ ٹھیک ہو جو آپ ہوں صائب

بہت دلکش سی اک مسکان سے بولے وہ مولانا
بہت مدت ہوئی کہ آپ مع اصنام ہیں غائب

کبھی سادہ سی باتیں آپ کے کانوں سے ٹکرائیں
ضروری ہے کبھی مسجد کو تو آئیں مرے صاحب

نہیں ملتی دوا ایسی کہ رکھ دوں زخم پہ فوراً
ہدایت تو سعادت ہے، وہ لہجے پر نہیں جاذب

یہ مانا علم تو محدود ہے، پر کیا کبھی ایسا
ہُوا؟ تُو مولوی پائے نہیں، جب علم کا طالب

یہ علم و ناطقہ تیرا شرارت کا وطیرہ ہے
ہدایت ڈھونڈنے والے تو نظرِ پیر سے ثاقب

تضادِ گفتگو جو تُو نے میری ذات میں دیکھا
نہیں یہ بات میں، بس تُو رہا ہے جزو کا عاقب

بہت یہ بات جاذب ہے جو میں دب جاؤں ثروت سے
مری دنیا جو عاجز ہے، تری دنیا بہت غاصب

مجھے روٹی نہ ملتی تھی میں جب تحصیل کرتا تھا
بدل دے میری قسمت تُو، اگر تقدیر کا کاتب

گیا اب سعد مسجد سے کہ آنکھوں میں ندامت تھی
مرے مولا، سدا رستہ مجھے دکھلا دے حق جانب

غزل

دلِ امید نے پکارا ہے
تو مجھے حسرتوں سے پیارا ہے

نام کچھ ہم انا کا لیں ورنہ
تری چاہت میں سب گوارا ہے

عشق میں آپ اک ہمارے ہیں
جو بھی باقی ہے سب تمہارا ہے

غمِ دوراں ہو کہ غمِ جاناں
بس تری یاد کا سہارا ہے

زخم گہرا دکھائی دیتا ہے
تیر کس بے رخی سے مارا ہے

چل ترے ساتھ ہو لئے ہم بھی
ورنہ منزل یہی کنارا ہے

آج پھر جھوم اٹھے ہیں بادل
اس نے پھر سعدؔ کو پکارا ہے

کرونا وائرس

شاہدرے پہ شہر کے
لوح یہ لگائی ہے
یہ وبا جو پھیلی ہے
کرب ہے، تباہی ہے

سب رہو مقید اب
گھر کے ایک کونے میں
منہ کو باندھ کپڑے میں
ہاتھ آب پونے میں

جانتے ہو ، پھیلے ہے؟
ہاتھ یہ ملانے سے

جان کھینچ لیتی ہے
پیار یہ بڑھانے سے

چھینک گر جو آ جائے
چھوت بن کہ لگتی ہے
لگ گئی وبا گر تو
بس ہلاک کرتی ہے

آؤ اب تو سَر جوڑیں
چال ایسی چلتے ہیں
یوں وبا نہ جائے گی
خود کو ہم بدلتے ہیں

اب نہ کوئی بچہ بھی
ماں کے پاس جائے گا
پیار مانگ لے من تو
خود کو آزمائے گا

مسجدیں مقفل ہوں
یاد دل میں رب کی ہو
بات وہ ہی اچھی ہے
خیر جس میں سب کی ہو

گر کوئی پڑوسی جو
مر گیا تو مرنے دو
سب جو خوف سے بلکیں
کیا کریں ہیں ڈرنے دو

کاروبارِ دُنیا اب
اک گناہ کبیرہ ہے
بھوکے پیٹ سونا تو
فقر کا وطیرہ ہے

بانٹنے جو سُکھ دُکھ ہوں
فون کا سہارا ہے
یہ علوم کا ہم پر
کرم ڈھیر سارا ہے

اب نہ کوئی رشتہ ہو
مرغزارِ الفت میں
فاصلے ہی اچھے ہیں
اِس جہانِ عجلت میں

عِلم یُوں بھی پیشہ ہے
تندہی بھی لازم ہے
بند کر دو عُرف و علم
عقل کو یہ جاذم ہے

وائرس یہ کیسا ہے
سارس کے یہ جیسا ہے
اور کہاں سے آیا ہے
چین نے بنایا ہے

کب سے سوچتا ہوں میں
اب عذاب چینی ہیں
اس کے ہر مداوا میں
ادویہ ہی پینی ہیں

خواب ہے جو غفلت کا
اُس سے گر جگانا ہو
کیا وبا ہو جو آئے
قوم گر بنانا ہو

گر خُدا نے بھیجی ہے
یہ وبا زمانے کی
کیوں نہ سعئ محکم ہو
اُس کو ہی منانے کی

فرد عہد کر لے اب
ہر حکم بجا لاؤں
مُستقیم رستے کا
ضابطہ بھی دِکھلاؤں

طور اور عقیدہ بھی
پوچھتے ہو کیسا ہو
ہر قدم یہ کہتا ہوں
مصطفیؐ کے جیسا ہو

حال میں رہو پر تم
روشنی لو ماضی سے
عمرؓ سے علیؓ سے اور
حسنؓ سے بھی، رازی سے

سعد کو، جگانے کو
پھر وبا نہ آئے گی
رحمتوں کی بارش میں
خلق جھومے گائے گی

ڈاکٹر اختر نواز ملک کے نام

پیغامِ محبت کے مفاہیم سِکھا کر
الفاظ کے دِیوان طبیعت میں بسا کر
اختر تھا میرا دِل جسے ویران کر گیا
وہ کیا گیا کہ غنچہ بیابان کر گیا

چہرے پہ تبسم تھا جو آنکھوں میں نمی تھی
نفرت کی تمازت کی بس اِک اُس میں کمی تھی
رُتبے میں سبھی ایک ہیں، اعلان کر گیا
وہ کیا گیا کہ غنچہ بیابان کر گیا

گفتار تھی ملبوس جو اشعار میں اس کی
چہکار بھی محروم تھی اظہار سے اس کی

جو غم میں بسی یاس کو مُسکان کر گیا
وہ کیا گیا کہ غنچہ بیابان کر گیا

ہر فن کی سیادت پہ گیا بات یہ سکھلا
گر ماہرِ فن ہے تو اُسے ہار کہ دکھلا
ہارے ہوئے کو صاحبِ میدان کر گیا
وہ کیا گیا کہ غنچہ بیابان کر گیا

رہتا فراخ دل تھا وہ تقسیم کیلئے
ہر وقت میسر تھا وہ تعلیم کیلئے
پونجی تمام اپنی ہمیں دان کر گیا
وہ کیا گیا کہ غنچہ بیابان کر گیا

اِک طرزِ تغافل تھا کہ جذبات کا سیلاب
جب ڈھیر لگی راکھ پہ بُنتا تھا کئی خواب
کم نظر اماموں کو پریشان کر گیا
وہ کیا گیا کہ غنچہ بیابان کر گیا

باتوں میں حلاوت تھی جو چہرے پہ دمک تھی
سب رُوح کے تابع تھی جو لہجے کی تمک تھی
ہر حرفِ تصنّع کو وہ ایمان کر گیا
وہ کیا گیا کہ غنچہ بیابان کر گیا

ہے سعد سے بھی اُس کی وفا،ایک کہانی
دُشوار ہے معانی سے غزل ایک بنانی
جاتے نہ مِلا، ہجر کو عنوان کر گیا
وہ کیا گیا کہ غنچہ بیابان کر گیا

غزل

نغمۂ مضطرب بے اثر ہو گیا
ہو مبارک حریصِ ثمر ہو گیا

اب نہیں زندگی میں کوئی مسئلہ
مال دولت جو زادِ سفر ہو گیا

حاضری سب نے دی حاکمِ وقت کو
میں بھی دے کہ زماں سے نڈر ہو گیا

بدنصیبی، بڑوں کو بُرا کہہ رہا
جن کی سُنتا رہا، دربدر ہو گیا

وہ تو کہتے تھے تعمیر کر لے خودی
خود شناسی سے بھی بے بہر ہو گیا

ہوں گے میزان پر سب کے نامہ عمل
تھا یقیں جو کبھی اب تو ڈر ہو گیا

ایک گُتھی تھی مغرب میں مستُور کا
بدن عُریاں کہ سینہ سَپر ہو گیا

فکرِ انساں پہ قدغن جو ممکن نہیں
یہ ہمالہ بھی اب مجھ سے سَر ہو گیا

اَب مری پُشت پر آہنی ہاتھ ہیں
جان لو اب کہ میں مقتدر ہو گیا

میرے پیشے کو ہیروں سے تولا گیا
عادلوں کا میں چشمِ نظر ہو گیا

میری تقریر کی چاشنی کیا کہوں
سب دلوں میں مرا آج گھر ہو گیا

خُو عجب تھی مری جب تلک حق پہ تھا
اب حقیقت میں میں دیدہ ور ہو گیا

خود فریبی قیادت کی بنیاد ہے
چاہے کہہ لو منافق، میں سَر ہو گیا

جھوٹ دھوکا ہے یہ سب نے جانا مگر
سچ بھی جھوٹوں کا ہی اب ہنر ہو گیا

عاجزی ، انکساری کی کس کو پڑی
اب مرا فلسفہ مختصر ہو گیا

جو امامت پہ اُمت کی مامور تھا
آج قرآں مرا منتظر ہو گیا

سُرعتِ برق سا سیکھتا ہوں میں سب
راہِ دُنیا سے میں بہرہ ور ہو گیا

جا تو رنگِ جہاں سعد کو بھی سکھا
دعوتِ حق میں وہ دربدر ہو گیا

وطن جو بنایا تھا اُسکی کہانی..

سُنو دوستو طائروں کی زبانی
وطن جو بنایا تھا اُسکی کہانی

کہا تھا تشخص ہمارا جدا ہے
کئی اُن کے، اپنا تو اک ہی خدا ہے
تو کیوں دربدر میں پھرایا گیا ہوں
ہر اک موڑ پے میں ستایا گیا ہوں

توقع ہماری بہت ہی سہانی
وطن جو بنایا تھا اُسکی کہانی

ہمارے تشخص کا زیور حیا ہے
کہا تھا کہ رشتوں میں لازم وفا ہے

مگر اب ثقافت کچھ ایسے پلے گی
مرا جسم ہے، میری مرضی چلے گی

جو صوفی نے تکرار کی، وہ نہ مانی
وطن جو بنایا تھا اُسکی کہانی

خودی کے سنائے تھے ہم کو فسانے
امامت کے تانے، امامت کے بانے
مگر اب وہ ملت کہاں، جس کا تارا
ممولوں سے بھڑ کے ہے شاہین ہارا

کہ مومن کی اب ہے سحر، آنجہانی
وطن جو بنایا تھا اُسکی کہانی

'پرندوں کی دنیا کا درویش' تھا جو
ٹکّوں کا، سِکّوں کا بھکاری بنا وہ
''نہیں اب بلندی نہیں دلنوازی''
کہ مومن ہوا جاتا ہے بے نمازی

تفاخر ہے راجہ، تو دولت ہے رانی
وطن جو بنایا تھا اُسکی کہانی

ہوئی کُند مومن کی شمشیر برقی
جواہر ہوئے جا رہے سارے مشقی
زمانے مطابق بدل دیں جو دِیں کو
زیاں معتدل، مغربی ہے نہ شرقی

کہاں سے سناؤں ترنگیں پرانی
وطن جو بنایا تھا اُسکی کہانی

مقدر کو مفلس یہاں رو رہے ہیں
جو دہقاں تھے وہ حسرتیں بو رہے ہیں
کہیں تن کا سودا، کہیں من کا سودا
سیاست، سیادت، تمدن کا سودا

ہوئی ختم دل اور خرد کی جوانی
وطن جو بنایا تھا اُسکی کہانی

چمن ایسے دیدہ وروں کی پناہ میں
نہیں اشک نرگس کی چشمِ سیاہ میں
کوئی اشک بھر دے کہ بے نور نرگس
نگاہ سے جلا دے، ٹھکانہء کرگس

حرارت سے ایماں بنے جاودانی
وطن جو بنایا تھا اُسکی کہانی

ہیں زرخیز یورپ کی اب بھی مشینیں
ہیں زاہد کی مقبوض اب بھی زمینیں
ہے مسلم کو مسلم کا دشمن بنایا
ختم کرکے الفت، شبِ خوں منایا

چلائے وہ خود پر ہی نشتر کمانی
وطن جو بنایا تھا اُسکی کہانی

جو مُبلس نے شوریٰ منعقد کرائی
عمل کر رہے اُس پہ، اُسکے سپاہی

مراسم سے بھی دور کر دو، صدا ہے
یوں ضابط کا دیں زندگی سے جدا ہے

خضر کی گُزشت اب کہاں ہے سنانی
وطن جو بنایا تھا اُسکی کہانی

دُعا بن کہ لب پہ جو آتا تھا نغمہ
بدل دے جو دل کو وہ ایسا تھا کلمہ
نہیں جن کا معنی وہ اب گا رہے ہیں
اسی پے وہ تحسین بھی پا رہے ہیں

لگے ہے کوئی اور ہی اِس کا بانی
وطن جو بنایا تھا اُسکی کہانی

خُدایا ہمارے تو اب بھی بدل دل
قدم روند سکتے ہیں کیا اب بھی ساحل؟
مری بازگشتِ زباں حال کر دے
کہ اُمت کا ایماں تہہ و بال کر دے

پھرے سعد سب کو سنائے زبانی
وطن جو بنایا تھا اُسکی کہانی

سُنو دوستو طائروں کی زبانی
وطن جو بنایا تھا اُسکی کہانی

گناہ

روح راغب ہے رقصِ فنا کیلئے
جان لڑتی ہے حرصِ بقا کیلئے
اِس فنا و بقا میں تصادم سہی
سب مرے جا رہے ہیں گُناہ کیلئے

کیا گناہ کا محل، کیا ہے نوع، کیا نسل
اِسکی بوئی ہوئی کاٹتے ہیں فصل
یہ چھپائے نظر سے ہمیشہ اصل
دل چہکتا مگر مضطرب ہے عمل

کیا یہ الفاظ کی گُتھیوں کا مکیں
یا خیالات کی لغزشوں کا امیں

کیا تذبذب کی بھٹی میں رہتا رہا
مضطرب ہو وجود اس پے کامل یقیں

اِسکی تصویر کیوں سُرمئی رنگ میں
بے لباسی مقدر ہے ہر ڈھنگ میں
کیوں گراں ہے یہ طبعِ بشر پہ کہ جب
یہ ہی فاتح ہے باطن کی ہر جنگ میں

جو نہ ہو تو تمنا بڑھاتا رہے
ہو جو جائے،خودی کو مٹاتا رہے
دل کی دنیا میں ایسا بسیرا کرے
روز آتا رہے، روز جاتا رہے

گر ہو طاقت میں، کچھ بھی نہ اِسکے سوا
پر نخیفی میں واجب کرے ہے سزا
یہ وفا کی ریاضت سے ہے نابلد
ہاتھ جب بھی ملایا ،دیا ہے دغا

اِس نے ہامان کو دی تھی جادو چھڑی
کیسے لپٹا، زلیخا کو اپنی پڑی
آذرِ وقت کے یہ تعاقب میں تھا
نفسِ فرعون سے بھی ملی ہے کڑی

کیا کروں جبر خود پہ کہ مدفون ہو
وارِ بے تیغ سے اِس کا بھی خون ہو
اس کی خوراک میں وہ زہر دے ملا
اِذنِ شاہیں کی منت کا مرہون ہو

اِس کا تریاق نظموں میں ہم نے دیا
جامِ محکم یقیں جس نے دل سے پیا
پھر اگر اُس کا در کھٹکھٹایا گیا
کرکے توبہ حقیقی وہ من سے جیا

نئی حویلی

حویلی اک بناتے ہیں
حویلی کے ستونوں کو
ہوس کے، شہوتوں کے بیل بوٹے سے سجاتے ہیں
تراشیں در دریچوں کو
جہاں منڈیر ڈھلتی ہے
دیا، دولت کے ایندھن سے وہاں آؤ جلاتے ہیں

حویلی اک بناتے ہیں
اُجالے پھینک کر باہر گلی میں
چہل کچھ قمقموں سے لے کے آتے ہیں
وہ ننھے قہقہے میرے ممولوں کے
کچل کر ان کو اک تہذیب کا آئیں بناتے ہیں
حویلی ہو بڑی سی اور۔۔

بہت سے اُس میں کمرے ہوں
ہر اک کمرے میں اک آراستہ کرسی پڑی ہو اور
گھمائیں اس کو جب بھی تو
سمے یوں ٹکٹکی باندھے
اُسے دیکھے
لگے یوں گردشِ حالات اس کُرسی کے ہیں مرہوں
کہ ہوگا حُرمتِ جذبات کا بھی بس اسی سے خوں
عقب میں دور اک حصہ کہ جس میں ہے
کہیں تدریس کا پیشہ، کہیں تعمیر کا پیشہ
ارے، تدریس پیشہ ہے؟
تو کیا تعمیر پیشہ ہے؟
اگر پیشہ ہے تو نامہ فصیلوں پر سجاتے ہیں
اگر پیشہ ہے تو اُس کی بڑی بولی لگاتے ہیں

حویلی اک بناتے ہیں
وہاں مدخل پہ، استقبالیہ ہو جس پہ اک لڑکی
ہنسی کو بیچتی ہو، مسکراہٹ کی زباں بولے
اٹھائے تاک رکھے، صنف جو اُس میں حیا کی ہو
وبالِ جاں ہو اس کی بے رُخی، صورت بلا کی ہو

ذرا اُس سے قدم آگے، ذہانت کی دُکاں کھولے
بہت سے خوبرو چہرے
تکلم بیچتے ہوں، زرتشیں باڑوں میں لپٹے ہوں
تعلم کھوجنے والے، اُنہیں باڑوں سے چمٹے ہوں
انہیں بیلوں کو گویا ڈور سے منڈھے لگاتے ہیں

حویلی اک بناتے ہیں
کہیں گُم گوش حصے میں
الگ درجے کہ ہر درجہ بھرا ہے نوجوانوں سے
اُٹھائے کاسۂ تشنہ۔۔
کہ جیسے چار بوندیں ان کو بھی سیراب کر دیں گی
تراشیں گی حجر کو، گوہرِ نایاب کر دیں گی
مگر ہوں شعلہ برنظریں
جو کر دیں کاسۂ تشنہ میں اک ایسا شگافِ دُر
زمانہ بیت بھی جائے مگر نہ جوف اس کا پُر
نگاہوں میں تمازت آ وَلاتے ہیں

حویلی اک بناتے ہیں
حویلی بن گئی سعد
فصیلیں، در، دریچے سب بنے مطلوب کی مانند

نگاہیں، کاسۂ تشنہ بھی ہیں محبوب کی مانند
تکلف اور مدخل بھی بایں مطلوب کی مانند
مموں لے سسکے سسکے اور تکلم سود کی مانند
دیے میں دولت وعشرت، ترنگِ خوب کی مانند
تلاطم کر دیا پیدا، مٹا رکھی سیادت بھی

نویلی اِس حویلی نے۔۔۔۔۔
نہیں ہے وہ زمانہ دُور کہ سب یک زُباں ہوں گے
بنی ترموم سے اس کج حویلی پر فُغاں ہوں گے
بنی ترموم سے اس کج حویلی کو گراتے ہیں
حویلی اک بناتے ہیں

حوصلہ پھر سے زمانے کو دکھا سکتا ہے
راکھ کے ڈھیر میں جو آگ لگا سکتا ہے
جیتنے والا اگر ہارنا بھی سیکھ گیا
کون پھر ایسے سپاہی کو ہرا سکتا ہے

مادہ پرستی

اُستاد نے اس دور میں کیا علم پڑھایا
مادہ کے تخیل کا خریدار بنایا

نے رُوح جو پابندِ نباتات و جمادات
مت بحث میں لا اس کو کہ نے ٹھوس نہ مائع

وہ دشتِ تصور کا مسافر تھا فقیہو
جس رِند کو کل رات ہے سُولی پہ چڑھایا

مجنوں کبھی کہہ دیتے ہو، کہہ دیتے ہو فرہاد
جو نام بھی دو، عشق کا ہی جام پلایا

تم چاند کو بے نور کہو، ہم کہیں روشن
درویشیِ بصیرت ہے نِرا نور کا سایہ

جو صاحبِ زر ہے تو رفو سوز ہے منطق
لاچار کو منصف نے بھی سُولی پہ چڑھایا

ہے برق سے آہستہ جو جذبات کی رفتار
توصیفِ محبت کو ہے فرہنگ سے مٹایا

کب قلب سلیمی کا سزاوار بنے گا
جب خِرد کو اصناف کا اُستاد بنایا

رُوپوش نہ ہو زن کی حلیمی و کلیمی
بازارِ حُسن کیسی نزاکت سے سجایا

حرکت کا بھی قانون ہے، قوت کا بھی قانون
اِنصاف کی مفلس کو تگ و دو میں لگایا

جو ضیغمِ دشتی ہے وہ پابندِ سلاسل
شاہیں کا تفاخر تھا جو کوؤں نے بُھلایا

دِل خون کیا سعد نے، اوراق پے لکھا
لوگوں نے مرکب کا غزل نام بتایا

ڈاکٹر اسرار احمد کے نام

سنو تم مردِ میداں تھے۔۔

کبھی عالش ، کبھی تابش، کبھی دلدار کے جیسے
کبھی مثلِ فقیراں، مردِ ذی وقار کے جیسے
کبھی جو آنچ آتی ہم پہ تو دیوار کے جیسے
کبھی جو سانچ کا عُقدہ ہوئے تلوار کے جیسے

کبھی بھادوں برستی، بامحل چھتنار کے جیسے
کبھی رستہ بھُلا بیٹھیں تو تم مینار کے جیسے
کبھی غم میں جو ڈوبیں ہم تو تم غمخوار کے جیسے
کبھی سینہ جلے تو برف کی سلہار کے جیسے

سنو تم مردِ میداں تھے۔۔

انا کو ہم خودی مانے، حقیقت کو بھلا بیٹھے
تصور آدمیت کا زمانے سے گنوا بیٹھے
کبھی دولت کی دیوی کو، کبھی نفسِ امارہ کو
خدا کہتے نہیں تھے پر خدا ہی تو بنا بیٹھے

تحرک کی نئے معنی، تصوف کی نئ راہیں
ریاضت کے اُفق سے فقر کو ہم ڈھونڈ کے لائیں
کبھی دلدل میں پھنس جاتے زمانے کے تغیر سے
بتاتے تم ہی رہتے تھے کہاں سے لوٹ کے جائیں

سنو تم مردِ میداں تھے۔۔

کہا جو بھی ہمیں اس پر عمل بھی کرکے دکھلایا
منش درویش کی سی عقل پہ تھا نور کا سایہ
چمک آنکھوں میں ایسی کہ تدبر کی مثال اپنی
تقرر دلنشیں ایسا کہ کُل معنی کا سرمایہ

تری مرقد منور ہو،فلاح و فوز پا جائے
تری ہر حسرتِ پیہم کما حق خوض پا جائے

دعا گو سعد رہتا ہے ترے احسان ہیں اُس پر
مقامِ رافعہ تیری نگاہِ سوز پا جائے
سنو تم مردِ میداں تھے۔۔

غزل

قبر پے ملنے ملانے آیا
ایک مُردے کو جلانے آیا

تیری یادوں نے نہ پیچھا چھوڑا
گو کہ میں تجھ کو بھلانے آیا

میرے معبود مجھے لوٹا دے
دیکھ تو کون منانے آیا

میں جو سننے کو مچلتا تھا کبھی
آج وہ قصے سنانے آیا

ہاتھ کیوں رکھ دیا ہے کتبے پر
اب بھی نے نام مٹانے آیا

کیوں گیا دور یہیں پاس تُو آ
پھر مرے دِل کو دُکھانے آیا

اِک نظر مُڑ کہ تو دیکھا ہوتا
کب تجھے پیار نبھانے آیا

پہلی ملاقات

رات کا پچھلا پہر
سنسناتی ہوئی گلیوں میں کسی کی آواز
اور ماحول کشیدہ سا، سماں پُر اسرار
سر جھکائے ہوئے، آنچل کو بھی ڈھلکائے ہوئے
اپنی پلکوں پہ محبت کی لو جلائے ہوئے
منتظر تھا کوئی آہٹ یہ قریب آ جائے
میری بانہوں میں مرا لکھا نصیب آ جائے

پر یہ چہرے پہ تحیّر کے ہیں آثار سے کیوں
کانپتے ہاتھوں سے دِکھتے ہیں وہ بیمار سے کیوں

اُف یہ دستک، میرے اللہ میں کہاں کو جاؤں
اپنے جذبات کو کیسے میں زباں تک لاؤں

اس کی نظروں کی تمازت میرے اللہ لے لے
یا میں نظروں کو اُٹھا پاؤں وہ ہمت دے دے

قُرب اتنا تھا کہ بس سانس جدا لیتے تھے
دُور رہنے کا بھی اُس پل میں مزا لیتے تھے

رات کا پچھلا پہر
اور اُن آنکھوں میں خُمار
لفظ بھی گرم دہکتے ہوئے جیسے انگار

کرب کی اور مروت کی حدوں کے اُس پار
اپنے محبوب سے خلوت میں ملا تھا اِک بار

کیا یہی عشق، محبت ہے، یہی ہے وہ پیار؟
کیا اِسی درد میں مٹ جاتا ہے سارا سنسار؟

افراد سے فطرت کو جو مطلوب ہے تقویٰ
رکھنا وہاں اقوام نے انصاف کو اولیٰ
جو عدل پے مامور تو دنیا میں امامت
جنت ملے افراد کو، مُحکم اگر اُخریٰ

ساحلِ سمندر پر..

(Random Thoughts)

موج دوڑی آتی ہے
غم سُکون لاتی ہے
ساحلِ سمندر پر
تشنگی بڑھاتی ہے
دور وہ سمندر میں
پانیوں کے مندر میں
کوئی موج تو ہو گی
ہوگی ہر گھڑی تنہا
موج کے سمندر میں
ساز اُس کا ایسا ہے
دل ترنگ جیسا ہے
ساز جو دُہائی دے

وقت کو مٹا ہی دے
اِک سکوت کرکے جو
شور بن سنائی دے
ساز ڈوبنے کا ہے
دل کو لُوٹنے کا ہے
کانچ ٹوٹنے کا ہے
ساز دل کو لے ڈوبے
جو بھی سُننے آتے ہیں
مستیاں اُڑاتے ہیں

اور کچھ پرندے بھی
وسط میں سمندر کے
مستیاں مناتے ہیں
وسط میں سمندر کیا
مستیوں کا محور ہے؟

کون یہ پڑھائے گا؟
اِن سبھی پرندوں کو
کون یہ سکھائے گا؟

اُن کو یہ نہیں معلوم
ہم جہاں پہ اُڑتے ہیں
وہ مقام ایسا ہے
خواب کے وہ جیسا ہے
دُور ساحلوں والے
اُس کو دیکھ سکتے ہیں
اُس پہ اُڑ نہیں سکتے
اور ایسے خالی ہاتھ
ساحلِ سمندر سے
گھر کو مُڑ نہیں سکتے

جب کبھی پرندے وہ
دُور اڑان بھرتے ہیں
سب انہیں یوں تکتے ہیں
جیسے کوئی سکتے میں
بختِ بد کے تختے پہ
جھانکتا ہے قسمت کو
ناز اس پہ کرتا ہے

یوں اداس کرتے ہیں
جیسے وہ بہت تنہا
دم دکھوں کا بھرتے ہیں
ساحلِ سمندر پر
کتنے لوگ آتے ہیں
مستیاں اُڑاتے ہیں
ساحلِ سمندر کیا
مستیوں کا محور ہے

ساحلِ سمندر تو
طلسمی سا منظر ہے
خوف بھی ہے منظر میں
درد بھی ، خوشی بھی ہے
باطنِ فروتر میں
بے کلی غضب کی ہے
غم بھی ہے تمنا بھی
اک عجیب دنیا بھی

ساحلِ سمندر سے
چاند کیسا دِکھتا ہے
خوبرو بھی، روشن بھی
بادلوں میں ملتا ہے
ہاں اُداس کرتا ہے
پر خوشی بھی بھرتا ہے
کیا نہیں عجب یہ سب
خُوبرو اداسی سی
خواہشیں بھی باسی سی
لوگ کیوں سمندر پر
مستیاں اُڑاتے ہیں
جُھنڈ میں کیوں آتے ہیں

کیوں نہ میں اکیلا ہوں
رات ہو، سمندر ہو

ذہن بھی ہو خالی سا
کوئی حاشیہ نہ ہو
نہ خوشی نہ کوئی غم

بس فقط سمندر پر
میں ہوں اور موجیں ہوں
ساحلِ سمندر پر۔۔۔۔

صنفِ خاص (اختر نواز)

ا۔ اِک تبسم کہ ہونٹ پہ رقصاں
خ۔ خِردِ ظاہر میں عشق ہے پنہاں
ت۔ تر رہے آنکھ اشکِ ناداں سے
ر۔ رتجگا گو کہ ناصیہ فرساں
ن۔ نسل کیا، نامِ آدمی ہے کیا
و۔ وہ نہیں جُز کا قیدی زنداں
ا۔ ابلہ پا سفر زندگی کا دِکھے
ز۔ زندگی لُطف اسلئے جاناں

صنفِ خاص (علی احسن)

ع۔ عُمیق نظر زمانے کی چال پہ رکھے
ل۔ لباسِ ظاہر و باطن کمال پہ رکھے
ی۔ یقیں کی جُہدِ تمام اگلے سال پہ رکھے
ا۔ اُمید و آس چمن کے زوال پہ رکھے
ح۔ حریم و بے غرض ایماں کی جستجو رکھے
س۔ سَکوں کی حرص وُجودِ جلال پہ رکھے
ن۔ نمازِ عشق میں سرِ سجدہ مال پہ رکھے

تم مجھے اچھے لگتے ہو

تم مجھے اچھے لگتے ہو
تم مجھے اچھے لگتے ہو

ہے مسکان تمہاری قاتل
نیکی کے تم لگتے قابل
رات کو تم دکھتے ہو جاہل
دن کو مگر لگتے ہو عادل

بات کے تم کچے لگتے ہو
تم مجھے اچھے لگتے ہو

صفت کروں تو ہونٹ دبا لو
برا کہوں تو آنکھ جھکا لو

بات نہ مانوں، منہ لٹکا لو
ہنسوں جو تم پہ، تم شرما لو

طبع سے تم بچے لگتے ہو
تم مجھے اچھے لگتے ہو

زخمی میں جو، تم چلاؤ
اپنے زخموں کو سہہ جاؤ
رُوٹھوں کو تم ایسے مناؤ
اپنی ذات کو بھول ہی جاؤ

من کے تم سچے لگتے ہو
تم مجھے اچھے لگتے ہو

جھوٹ سے چنداں کتراتے ہو
سچی بات پہ ڈٹ جاتے ہو
کِبر، تفاخر مٹواتے ہو
نفس کی عزت کرواتے ہو

نہیم کے پکے لگتے ہو
تم مجھے اچھے لگتے ہو
تم مجھے اچھے لگتے ہو

غزل

اجڑتے منظر بکھرتے خوابوں میں کوئی تم کو بلا رہا ہے
کوئی تمہارے لیے ابھی تک دریچے اپنے سجا رہا ہے

دیا جلا کہ ملے جو فرصت اندھیری راتوں میں ایک پل کی
تو سوچ لینا کہ ظلمتوں میں وہ کتنے آنسو گنوا رہا ھے

مرے تصور میں ایک شمع تمہاری ہی لو سے جل رہی ہے
پر آنسوؤں کا نگیں تسلسل سمٹ کہ اس کو بجھا رہا ہے

ھمارے سینے میں تشنگی ہے تمہاری باتوں میں بے رخی ہے
مری محبت کا تند طوفاں یہ دوریاں بھی مٹا رہا ہے

عجب ادا سے کہا تھا اس نے ، ملن تصور کی اک کڑی ہے
شعور میرا بہل کے تب سے تھپک تھپک کے سلا رہا ہے

جو دیکھ لوں تو اسی کو سوچوں، جو سوچ لوں تو اسی کو دیکھوں
نجانے دل کے نگر میں ایسے وہ شوخ کیونکر سما رہا ہے

وہ خود کو مجرم قرار دے کہ نظر جھکائے ہوئے کھڑا ہے
خدارا روکے، کوئی تو روکے کہ وقت چلتا ہی جا رہا ہے

وہ دھیما لہجہ وہ ترشیء لب ، وہ تھی شکایت کہ تھی حکایت
کہ جیسا بھنورا کسی کلی کو نئی ترنگیں سکھا رہا ہے

حسیں تصور کی نرم چھاؤں میں زندگی یوں گزر رہی ہے
کہ سعد ہر پل اسی تصور کے گیت سب کو سنا رہا ہے